آدمی کا باپ
www.FreePdfBooks.org
محی الدین نواب

ڈاکٹر عظیم صدیقی جانتا تھا اور پورے یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ شے می نہیں مرے گی۔ پھر بھی اس نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی تمام کوششیں کر ڈالیں۔ پہلی کوشش یہ تھی کہ اسے ایک نہایت ہی زود اثر زہریلا انجکشن دیا تھا۔ شے می نہیں جانتی تھی کہ اس کا خاوند اس کی جان کا دشمن ہے اس نے چپ چاپ انجکشن لگوا لیا زہر اس کے جوان جسم کے اندر سرایت کر گیا۔ چند لمحوں تک اسے اپنے اندر کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے باتھ روم میں جا کر قے کر دی۔ اس کے بعد اس نے پانی منہ میں لے کر کلی کی اور منہ پونچھتی ہوئی کھانا پکانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ عظیم صدیقی پریشانی سے سوچتا رہا کہ اپنی شریک حیات کو اپنی حیات سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دینے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا؟

شے می کا اصل نام شمیم بیگم تھا وہ نچلے طبقے سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ ڈاکٹر عظیم صدیقی نے دو مقاصد کے تحت اس سے شادی کی تھی پہلا مقصد تو یہ تھا کہ شمیم سترہ سال کی ایک حسین دوشیزہ تھی۔ ڈاکٹر پچپن سال کا بوڑھا تھا۔ اس عمر میں اتنی حسین لڑکی اس سے عشق نہیں کر سکتی تھی لیکن شمیم اس سے شادی کے لئے راضی ہو گئی کیونکہ وہ ڈاکٹر تھا اور یہ سرطان کے مہلک مرض میں مبتلا تھی۔

ڈاکٹر کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بیمار محبوبہ پر ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس تجربے سے صحت مند ہو جاتی تو یوم آخر تک زندہ سلامت رہتی ورنہ اس کے مرنے کا افسوس نہ ہوتا کیونکہ اسے بلڈ کینسر ہو گیا تھا اور اس کا مرنا یقینی تھا۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر کا تجربہ کامیاب ہو گیا اور بدقسمتی سے اس پر ایک جوان بیوی کا ہمیشہ کے لیے مسلط ہو گئی پہلے پہل اس کی جوانی کا اتنا شدید احساس نہیں ہوا کیونکہ ان دنوں وہ اپنے کامیاب تجربے پر نازاں و شاداں تھا۔ سب سے پہلے اس نے خوش ہو کر شمیم بیگم کا نام بدل دیا اور اسے پیار سے شے می کہنے لگا۔ انسان کے طبقوں کی طرح ناموں کے بھی طبقے ہوتے ہیں۔ نچلے طبقے میں جو شمیم اور رضیہ ہوتی ہیں وہ اونچے طبقے میں پہنچ کر شے می اور راضی بن جاتی ہیں۔

آدمی کا باپ

وہ میرا باپ تھا۔
میں اس کا باپ بن گیا
پھر وہ اس کا باپ بننے لگا
ایک شرمناک سوال کہ
ہم آدمیوں کا باپ کون ہے؟

شے می کی زندگی بدل گئی۔ نام بدل گیا۔ حتیٰ کہ بیمار اور لاغر جسم بھی ڈبل روٹی کی طرح صحت مند ہو گیا۔ بس اسی مقام پر آکر جوان بیوی اور بوڑھے خاوند کا فرق نمایاں ہو گیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ بیزاری سے "اونہہ" کہہ کر خاوند کے بیڈروم سے نکلی اور اپنے بیڈروم میں آکر ذرا آنسو بہا کر سو گئی۔

کوئی مرد اپنی عورت کی نظروں سے گرنا پسند نہیں کرتا حالانکہ اس میں مردانگی کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا۔ اگر کوئی عقلمند بوڑھا کسی جوان چھوکری سے شادی کرنے کی حماقت کرے تو یہ مرد برادری کی نہیں، بوڑھی برادری کی غلطی ہے۔

ویسے ڈاکٹر نے سوچا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ جو دوا اس نے شے می پر آزمائی ہے وہی دوا خود استعمال کرے گا اور شے می کی طرح جوان اور زندہ جاوید ہو جائے گا۔ دوا کا فارمولا اس کے پاس محفوظ تھا لیکن اسے تیار کرنے کے لیے سکون و تحمل کی اور ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی اور اس کا تمام سکون شے می نے درہم برہم کر رکھا تھا۔ جب بھی وہ پکی ہوئی فصل کی طرح اس کے سامنے لہراتی، وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ ایسی حالت میں وہ اپنے لیے آب حیات کیسے تیار کرتا؟ اگر مختلف دواؤں کے اوزان اور ترکیب میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی یا خامی رہ جاتی تو وہی آب حیات اس کے لیے سم قاتل بن جاتا۔

اس نے جھنجھلا کر یہ فیصلہ کیا کہ پہلے شے می کی موت کا سامان کرنا چاہیے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ پھر وہ اطمینان سے اپنے فارمولے پر عمل کرے گا۔ شے می کی جگہ ابدی زندگی حاصل کرنے کے بعد اسے لاکھوں حسینائیں مل جائیں گی۔

لیکن پہلی کوشش میں وہ ناکام ہو گیا۔ وہ زہریلا انجکشن شے می کے جسم میں گیا اور پانی بن کر نکل گیا۔ دوسری بار ایسا ہوا کہ شے می آدھی رات کو تنہا باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ریوالور میں سائلنسر لگایا۔ پھر ایک ماہر نشانہ باز کی طرح پوری چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ شے می کے حلق سے چیخیں نکلیں۔ پھر وہ لڑکھڑا کر گھاس پر گر پڑی۔

ڈاکٹر نے ریوالور کو ایک جھاڑی میں چھپا دیا، اس کے بعد تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس وقت تک شے می اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے بدن سے ریوالور کی ایک گولی یوں نکال رہی تھی جیسے پاؤں میں چبھا ہوا کانٹا نکال رہی ہو۔ بدن کے دوسرے حصوں میں کئی سوراخ ہو گئے تھے جہاں جہاں سوراخ تھے وہاں خون کے دھبے نظر آ رہے تھے اگرچہ زیادہ مقدار میں خون بہنا چاہیے تھا لیکن وہ تمام سوراخ آپ ہی آپ بھرتے جا رہے تھے۔ فوم کے بستر میں انگلی گڑو دینے سے وہاں انگلی کا نشان نہیں پڑتا، فوم جلدی اپنی صحیح حالت میں آجاتا ہے۔ یہی حال اس کے فوم جیسے لچکیلے بدن کا تھا۔ ڈاکٹر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

شے می اس کے لیے دن رات کا عذاب بن گئی۔ جیسے جیسے دن گزرنے لگے، شے می کا مزاج بدلنے لگا۔ وہ اس لیے بیاہ کر نہیں آئی تھی کہ ایک خوبصورت ڈیکوریشن پیس کی طرح اس کے گھر میں سجی رہے اور خاوند اسے دور سے دیکھتا رہے۔ آخر وہ عورت تھی اس کی اپنی ضروریات اور جذبات تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کی عمر ایک جگہ تھم گئی تھی۔ ڈاکٹر کے بڑھاپے میں مزید پانچ سال کا اضافہ ہو گیا تھا اس کے چہرے کی جھریاں کچھ گہری ہو گئی تھیں اور شے می کے چہرے پر اور بدن کے شگوفوں پر وہی سترہ سال کی تازگی اور رعنائیاں تھیں۔ لہٰذا اس کا بہکنا فطری امر تھا وہ دوسروں کے بازوؤں میں کلی کی طرح چٹخنے اور پھول کی طرح مہکنے لگی۔

ڈاکٹر کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک بہت ہی مضبوط شیشم کی لکڑی کا تابوت بنانے والے بڑھئی کو اچھی خاصی رقم دیکر اپنا رازدار بنایا۔ کیونکہ آئندہ اس تابوت کو قبر کی تہہ میں پہنچانے کیلئے اُسے ایک معاون کی ضرورت تھی۔

جب وہ تابوت تیار ہو گیا تو ڈاکٹر شے می کو باتوں سے بہلاتا ہوا مکان کے تہہ خانے میں لیکر آیا۔ تابوت کھلا ہوا تھا اور شے می کے حسین وجود کا انتظار کر رہا تھا۔ قریب ہی بڑھئی کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے شے می کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

"چلو اب اس میں لیٹ جاؤ"

"نہیں!" وہ گھبرا کر بولی "کیا تم مجھے اس میں بند کر دینا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی قبر میں بھی زندہ رہو گی یا مر جاؤ گی؟"

"نہیں۔ میں جیتے جی قبر میں نہیں جاؤں گی۔ چھوڑ دو مجھے ——— جانے دو..."

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑھئی نے بھی آ کر اسے پکڑ لیا۔ وہ دو طرفہ شکنجوں میں تڑپنے لگی، پھلنے لگی۔ اگرچہ اس میں جوانی کا زور تھا۔ اس کے باوجود وہ عورت تھی اس میں عورت کی نزاکت تھی اور جلد ہی خائف ہو کر شکست کھا جانے والی کمزوری تھی۔ ان دو بوڑھوں نے اسے پکڑ کر زبردستی تابوت کے اندر ٹھونس دیا۔ پھر اس کے ڈھکنے کو بند کر کے اسے ہر طرف سے لاک کر دیا۔

تابوت کے اندر سے کھٹاکھٹ کی آواز آ رہی تھی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اندر پھڑپھڑا رہی ہے اور کچھ کہتی جا رہی تھی لیکن اس کی آواز منمناہٹ کی طرح باہر آ رہی تھی۔

وہ دونوں تہہ خانے سے باہر آ گئے۔ آئندہ کل تک ڈاکٹر کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر اس نے بڑی بے چینی سے کروٹ بدل بدل کر رات گزاری۔ دوسرے دن وہ تہہ خانے میں گیا۔ دور سے تابوت بالکل خاموش نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور تابوت سے کان لگا کر سننے لگا۔ گہری خاموشی تھی۔

خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا منہ لٹک گیا اندر سے کچھ ایسی سرسراہٹ سنائی دی جیسے وہ انسانی زندگی کے آخری بستر پر کروٹیں بدل رہی ہو۔

ڈاکٹر نے ناگواری سے تابوت پر دستک دی۔ دستک دیتے ہی جیسے اندر کھلبلی مچ گئی۔ وہ بھی اندر سے تابوت کی دیوار پر ہاتھ مارنے لگی۔

وہ جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تابوت پر ایک زور کی لات مارتے ہوئے بولا۔

"سالی جان کا عذاب بن گئی ہے لیکن میں بھی ضد کا پکا ہوں۔ اسی میں تجھے قید رکھوں گا

دیکھتا ہوں کب تک زندہ رہے گی۔ تڑپ تڑپ کر مرے گی۔"

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا تہہ خانے سے باہر آ گیا اور بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

شام کو بڑھئی اس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"اس عورت سے اس طرح پیچھا نہیں چھوٹے گا ہم آج رات اس تابوت کو جنگل میں لے جا کر ایک گہرے گڑھے میں دفن کر دیں گے کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ جنگل کے کسی حصے میں زمین کے اندر وہ چھپا کر رکھ دی گئی ہے نہ کسی کو معلوم ہوگا اور نہ ہی کوئی اسے کھود کر باہر نکالے گا۔"

وہ بہت دیر تک اسے اپنی پلاننگ سمجھاتا رہا جب رات گہری ہو گئی تو ڈاکٹر گیراج میں گیا وہاں سے اپنی ویگن میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے پچھلے دروازے پر آیا۔ بڑھئی کدال اور بیلچہ لے کر آ گیا۔ وہ دونوں ویگن کا پچھلا دروازہ کھول کر کوٹھی کے اندر آئے۔ پھر وہاں سے تہہ خانے میں پہنچے۔ تابوت پہلے کی طرح بظاہر خاموش نظر آ رہا تھا مگر جب وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے تہہ خانے سے نکالنے لگے تو اس تابوت میں پھر جان پڑ گئی وہ اندر ہاتھ مار مار کر دستک کی زبان میں التجا کر رہی تھی کہ اسے باہر نکالا جائے۔

مگر وہ دونوں اس کی التجا سے موم ہونے والے نہ تھے، اسے خاموشی سے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے اس وزنی تابوت کو تہہ خانے کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھاتے وقت انہیں پسینہ آنے لگا وہ ہانپ رہے تھے اور زور لگا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں تھک کر سانسیں درست کرنے کے لئے رک جاتے تھے۔ آخر بڑی عرق ریزی کے بعد وہ اسے تہہ خانے سے نکال لائے۔

کوٹھی سے باہر لا کر اسے ویگن میں رکھتے وقت بھی خاصی دشواری پیش آئی لیکن وہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ انہوں نے ویگن کے پچھلے دروازے کو اچھی طرح بند کیا پھر اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔

اندھیری رات کی خاموشی میں ویگن تیز رفتاری سے بھاگنے لگی۔ اس خاموشی میں ویگن کے پچھلے حصے سے کبھی کبھی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔

وہ سالی کے ہاتھ بھی نہیں رُکتے، طبلہ بجاتی جارہی ہے ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ اسے تابوت میں بند کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کو رسی سے اچھی طرح جکڑ دینا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کوئی کار والا بھی اور وہ ٹیک کرتے تحت اس طبلے کی آواز نہ سن لے۔"

بڑھئی گھبرا کر کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ہم آبادی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ آگے پیچھے کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی ہے اور آتنی رات کو بھلا اس ویران راستے میں کون آئے گا؟ کوئی نہیں آئے گا۔ ہاں کوئی نہیں آئے گا مگر مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

وہ دونوں ڈرتے جارہے تھے اور ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دیتے جارہے تھے دو گھنٹے کے بعد جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر ان کی وین ڈگمگاتی جارہی تھی پھر وہ گھنے درختوں کے درمیان آکر رُک گئی۔

ڈاکٹر نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ بڑھئی پچھلے دروازے کو کھول کر کدال اور بیلچے کو نکال رہا تھا۔ پھر وہ دونوں وین سے دور آکر گڑھا کھودنے لگے۔ بڑھئی کے ہاتھوں میں کدال تھی وہ کھود رہا تھا اور ڈاکٹر بیلچے سے مٹی اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کر رہا تھا۔

ایک زندہ عورت کیلئے قبر کھودی جارہی تھی بیلچے سے مٹی ہٹاتے وقت ڈاکٹر سوچ رہا تھا کہ ایک قبر میں دو انسانوں کے سونے کی گنجائش ہو سکتی ہے شمی تو وہاں تا قیامت پڑی رہے گی لیکن اس کے ساتھ وہ بڑھئی بھی قیامت کی نیند سوئے گا اتنے بڑے جرم کے ایک رازدار کو زندہ چھوڑنا دانشمندی نہیں ہے اس قبر میں تمام راز دفن ہو جائیں گے۔ تب ہی وہ اطمینان سے اپنے لئے آبِ حیات تیار کر سکے گا۔

چھ فٹ کی گہری قبر تیار ہو گئی۔ وہ دونوں وین کے پچھلے حصے سے تابوت کو کھینچتے ہوئے قبر کے کنارے تک لے آئے پھر اسے گہرائی میں دھکیل دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے جا کر قبر کی تہہ میں جم گیا ڈاکٹر نے بیلچے کو اٹھاتے ہوئے بڑھئی سے کہا۔

"ذرا جھانک کر دیکھو اور سنو، کیا وہ طبلہ بجا رہی ہے۔"

وہ قبر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر جھک گیا اور توجہ سے سننے لگا۔ آواز آرہی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ شمی تابوت کی دیواروں پر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

بڑھئی نے صرف چند لمحوں تک وہ آواز سنی۔ وہ چند لمحے ڈاکٹر کے لئے کافی تھے اس کے ہاتھوں میں وہ بیلچہ بلند ہوا اور بڑھئی کی کھوپڑی نشانہ بن گئی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی وہ قبر کے کنارے لڑھک گیا۔ دوسری بار بیلچے کا پھل اس کی گردن میں اتر گیا۔ گردن آدھی کٹ گئی تھی وہ تڑپ رہا تھا اور مٹی اس کے لہو سے بھیگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے وہ لاش قبر میں لڑھکا دی۔

"دھپ" کی آواز کے ساتھ وہ لاش تابوت پر جا کر اوندھی ہو گئی، دو انسانوں کی گنجائش نکل آئی ایک تابوت کے اندر زندہ تھی، دوسرا تابوت کے اوپر مردہ تھا اور ڈاکٹر بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر قبر کے خالی پیٹ کو بھر رہا تھا۔

گڑھا بھر گیا۔ زمین پہلے کی طرح ہموار ہو گئی۔ وہ بیلچے کو ایک طرف رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر اور زمین سے کان لگا کر سننے لگا۔ آواز نہیں آرہی تھی۔ منوں مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس لئے وہ سپاٹ قبر ساؤنڈ پروف ہو گئی تھی۔ اب اس دنیا کا کوئی فرد شمی کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔

وہ صبح پانچ بجے تک وہاں بیٹھا رہا پھر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔

ڈاکٹر عظیم صدیقی کے عملی تجربے کو وہ تینوں بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے اس وقت تینوں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

"کیا عظیم صدیقی آبِ حیات تیار کرے گا؟"

"شوں شک" کی ہلکی آواز کے ساتھ سفید دھوئیں کا ایک بھبکا صراحی سے اٹھ کر لیبارٹری کے صاف ستھری فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ شیشے کی صراحی سے دو فٹ کے فاصلے پر عظیم صدیقی

میں سے لگ رہا تھا اس کی نگاہیں صراحی کے پیندے پر مرکوز تھیں، جہاں زرد رنگ کا محلول نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ صراحی میں سے وہ سفید دھواں غائب ہونے لگا شاید زرد رنگ کے محلول میں جذب ہو رہا تھا۔

وہ تینوں اس عمل کو ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے صرف وہی نہیں بلکہ لیبارٹری کے ایک گوشے میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ہوا ایک بندر بھی اس عملی تجربے کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

ایک بندر کو بھلا سائنسی تجربات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ لیکن کہتے ہیں کہ آدمی اور بندر کی عادتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں اس تماشے کو خاص طور سے دیکھتے ہیں، جو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

بندر عظیم صدیقی کے تجربے کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ عظیم صدیقی ہمیشہ کی طرح اس دوا کو بھی اس پر آزمائے گا۔

وہ کٹہرے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تقریباً ستر سال سے بیٹھا ہوا اس لیبارٹری کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بندر کی طبعی عمر ستر سال کی نہیں ہوتی، کوئی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنی طویل مدت سے اس لیبارٹری کے کٹہرے میں اچھل کود رہا ہے اور اپنی بندریا کے ساتھ اس ایئر کنڈیشنڈ لیبارٹری میں عیش کر رہا ہے۔

اس نے سر گھما کر اپنی بندریا کی طرف دیکھا وہ بےچاری ایک جانب چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے بندر دانت نکال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے باپ بننے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔ یہ اس کی زندگی میں پہلی بندریا نہیں تھی ستر سال کے عرصے میں کتنی ہی آئی تھیں اور اپنی فانی عمر گزار کر چلی گئی تھیں۔ بندر سمجھتا تھا کہ وہ جو ماں بننے والی ہے وہ بھی کسی دن ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جائے گی اور اس کی جگہ پھر ایک نئی بندریا اس کا دل بہلانے آ جائے گی۔

اس نے سر گھما کر ڈاکٹر عظیم صدیقی کو دیکھا اسے یہ طویل عیش و عشرت کی زندگی عظیم صدیقی

کے دادا نے اپنے تجربوں سے دی تھی اس کے دادا کلیم صدیقی نے آبِ حیات تیار کرنے کی کوششیں کی تھیں انسان ازل سے ابدی زندگی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور اس کے لئے طبی سائنس میں نت نئے چونکا دینے والے تجربات کر رہا ہے خوش قسمتی سے کلیم صدیقی نے آبِ حیات تیار کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ان دنوں جدید طبی دوائیں، بےداغ فولاد کے آلات اور مشینیں وغیرہ نہیں تھیں اور ایسی ایئر کنڈیشنڈ لیبارٹری بھی نہیں تھی۔ کلیم صدیقی چٹائی پر بیٹھ کر ہاون دستے میں دوائیں پیستے اور حل کرتے تھے۔ کہاں وہ چٹائی پر بیٹھنے کا زمانہ اور کہاں یہ لیبارٹری کی ایئر کنڈیشنڈ دنیا۔ اس بندر نے انسان کے دماغ کو اور اس کی تہذیب کو کتنی ہی کروٹیں بدلتے دیکھا تھا۔

بہرحال کلیم صدیقی نے آبِ حیات تیار کر لیا تھا اور اسے اس بندر پر آزما کر اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ اگر اس دوا میں انسانی جسم کی مناسبت سے کچھ تبدیلیاں کر لی جائیں تو وہ اسے پی کر بندر کی طرح ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے اس خیال کے تحت اس نے مختلف فارمولوں سے اس آبِ حیات میں تھوڑی سی تبدیلیاں کیں۔ اسے اپنے تجربات پر بڑا اعتماد تھا اور اعتماد سے وہ اس آبِ حیات کو نوش کر گیا۔

بندر نے اس لیبارٹری میں بیٹھ کر عجیب عجیب تماشے دیکھے تھے۔ کلیم صدیقی نے اس کے سامنے ہی اس آبِ حیات کو نوش کیا تھا۔ فوری طور پر اس کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن ہر روز جب وہ لیبارٹری میں آتا تو پہلے سے زیادہ کمزور اور بیمار بیمار سا نظر آتا۔ وہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو آزما کر اس آبِ حیات کے ردِ عمل سے بچنے کی کوششیں کیں لیکن ایک روز اسی لیبارٹری میں خون تھوک کر مر گیا۔

اس کے بعد عظیم صدیقی کے باپ سلیم صدیقی کی باری آئی۔ سلیم صدیقی نے اپنے باپ کلیم صدیقی سے ہونے والی غلطیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا تو اس آبِ حیات میں کچھ ایسی خامیاں نظر آئیں جنہیں دور کئے بغیر ابدی زندگی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔

پھر بندر نے سلیم صدیقی کو اس لیبارٹری میں تجربے کرتے اور آبِ حیات میں رہ جانے

والی کمی کو پورا کرتے دیکھا۔ اسی لیبارٹری میں اُسے خوشی سے مغلوب ہو کر آبِ حیات کا جام چڑھاتے اور اپنے باپ کی طرح دم توڑتے دیکھا تھا۔

اور اب عظیم صدیقی کی باری تھی لیکن وہ اتنا جلد باز نہیں تھا اور اس دوا کو سب سے پہلے خود پر آزما کر اپنے دادا اور باپ کے عبرتناک انجام تک نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ بیس برس کی عمر سے اپنے باپ اور دادا کے ساتھ اس لیبارٹری میں کام کر رہا تھا یعنی اسے تجربات سے گزرتے ہوئے پینتیس ۳۵ برس ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے باپ اور دادا کی ذہانت اور تجربات میں اپنے پینتیس سالہ تجربات کو سمو کر نئے سرے سے آبِ حیات تیار کیا تھا پھر اسے اپنی جوان اور حسین بیوی شمے می پر آزمایا تھا۔

اس آبِ حیات کو شمے می پر آزمانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر شمے می اسے نوش کر کے مر جاتی تو دوسری بیوی آ سکتی تھی اور اگر زندہ جاوید ہو جاتی تو ـــــــ تو وہ اسے ٹھکانے لگا چکا تھا۔ شمے می دُور بہت دُور کسی جنگل میں منوں مٹی تلے دبی پڑی تھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہو گی یا مر چکی ہو گی۔

ویسے عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا اسے دفن کرنے کے بعد بھی وہ ہر دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا تھا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی ہٹائی تو نہیں گئی ہے؟ ہر بار وہاں پہنچکر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے اس جنگل سے کسی کا گذر نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی جانور کے پنجوں کے نشان بھی نظر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ پتہ نہیں وہ قبر کی تہہ میں وہ طبلہ بجا رہی تھی یا نہیں۔ اس گڑھے کو کھود کر طبلہ سننے کی جرأت نہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس حصے میں ہری ہری گھاس اُگنے لگی پھر زمین کا وہ ٹکڑا جنگل کی ہریالی کا ایک حصہ بن گیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جگہ کبھی کھودی گئی تھی۔

بندر نے کٹہرے کی سلاخوں کو تھام کر عظیم صدیقی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔

عظیم صدیقی شیشے کی نلکی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا اس کے تینوں ساتھی بھی اس تجربے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ بے زبان بندر اس لیبارٹری میں آنے والے ہر شخص کو جانتا تھا ان میں سے ایک جو سفید سرج کا سوٹ پہنے ہوئے تھا، اس کا نام ہارڈی مین تھا وہ کسی مغربی ملک سے عظیم صدیقی کے باپ دادا کی شہرت سن کر وہاں آیا تھا۔ بندر کی طویل عمری نے یہ بات مشہور کر دی تھی کہ کلیم صدیقی کے خاندان کا کوئی فرد ایک دن آبِ حیات بنانے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسی کامیابی کو دیکھنے اور سمجھنے کیلئے ہارڈی مین اکثر خاص موقعوں پر عظیم صدیقی کے ساتھ رہتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ کامیاب فارمولا اس کے ہاتھ آ جائے۔ وہ خود کو بہت ہی ذہین اور عظیم سائنسدان سمجھتا تھا۔ اب یہ دیکھ کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچ رہی تھی کہ آج عظیم صدیقی اس دنیا کے سب سے عظیم اور سب سے انوکھے تجربے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

ہارڈی مین سے تھوڑے فاصلے پر یہودی جیمس کھڑا تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے یہودی بہت زیادہ دولت مند ہوتے ہیں وہ بھی دولت کے اعتبار سے رئیس اعظم تھا۔ رئیس اعظم ہونے کے باوجود اس دنیا میں تنہا تھا تنہا اس لیے تھا کہ نہ تو اس نے جوانی میں شادی کی تھی اور نہ ہی بڑھاپے میں کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ جتنا دولت مند تھا اتنا ہی کنجوس بھی تھا اس کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ اگر شادی کرے گا تو بیوی کا خرچ بڑھے گا پھر اولاد ہو گی اور جوان ہونے تک بیٹھ کر کھائے گی۔ ظاہر ہے کہ باپ کی طرح اولاد بھی لالچی ہو گی لہٰذا اتنی ساری دولت حاصل کرنے کیلئے اپنے باپ کو بھی قتل کرنے سے باز نہیں آئے گی۔

جیمس موت سے بہت ڈرتا تھا اور موت سے زیادہ اپنی دولت سے ڈرتا تھا کہ موت کے بعد یہ پرائی ہو جائے گی اس لیے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح اس کی زندگی طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے۔ وہ کنجوس ضرور تھا لیکن دائمی زندگی کے لالچ میں اس کی دولت ڈاکٹروں کی جھولی میں جاتی رہتی تھی۔

پھر وہ عظیم صدیقی کی شہرت سن کر یہاں آیا اور اس سے دوستی گانٹھنے لگا۔

اس نے ستر سالہ بندو کو دیکھا تھا اور شے می جیسی بلڈ کینسر کی مریضہ کی حیرت انگیز صحت مندی کی رپورٹ پڑھی تھی اور اب اس کے سامنے جو آبِ حیات تیار ہو رہا تھا۔ اسے وہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر خریدنا چاہتا تھا۔

زندگی ـــــ ابدی زندگی ـــــ وہ شیشے کی شفاف صراحی کو اس طرح گھور رہا تھا اور انتہائی جوش اور جذبے کے تحت اس طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا جس طرح سانپ ڈسنے سے پہلے جھومتا ہے اس کی نگاہوں کا نشانہ ٹھیک صراحی پر تھا۔

ہارڈی اور جیمس کے درمیان سوسن بلارڈ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جوان تھی، حسین تھی اور اس کا جسم شراب سے بھری ہوئی بوتل کی طرح نشہ انگیز تھا۔ وہ ہارڈی کی سیکریٹری تھی۔

اس وقت وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں بالکل تنہا کھڑی تھی اس کے آس پاس کوئی نہ تھا صرف ایک شیشے کی شفاف صراحی تھی جس میں سرخ رنگ کا سیال لہریں لے رہا تھا اور اپنی ہر لہر کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں نے شے می کو سدابہار جوانی دی ہے۔

شے می کہاں ہے؟ آبِ حیات نوش کر کے کہاں غائب ہو گئی؟ سوسن نے یہ سوال عظیم صدیقی سے کیا تھا اور عظیم صدیقی نے ہر ایک کو یہی جواب دیا تھا کہ وہ جوانی اور ابدی زندگی کے غرور میں مجھے بھول گئی ہے اور اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

عورت کچھ نہیں چاہتی۔ وہ دولت نہیں چاہتی، وہ دین نہیں چاہتی، دنیا نہیں چاہتی کیونکہ یہ سب چیزیں مرد خود ہی اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے بشرطیکہ وہ جوان ہو۔ وہ اپنے حسن اور منہ زور جوانی سے مرد پر حکومت کر سکتی ہے، اس کی دولت چھین سکتی ہے اور اپنی توبہ شکن اداؤں سے اس کی عاقبت خراب کر سکتی ہے اسی لئے۔ محض اسی لیے عورت اپنی جوانی کی عمر طویل چاہتی ہے۔

سوسن اپنے تازہ رخساروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کیا ان رخساروں پر کبھی بڑھاپے کی جھریاں پڑ جائیں گی؟ وہ کانپ سی گئی عورت اپنے برے اعمال سے نہیں کانپتی بڑھاپے کے تصور سے کانپ جاتی ہے۔

"نہیں۔ میں بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ صراحی کا وہ سرخ سیال میرے لیے۔ صرف میرے لیے ہے۔"

"ہاہاہا۔" لیبارٹری کی خاموشی میں عظیم صدیقی کا قہقہہ گونجنے لگا۔ وہ صراحی کی گردن کو اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میرے معزز دوستو! دیکھو۔ دیکھو میں نے آبِ حیات تیار کر لیا ہے۔ یہ دنیا والے میرے دادا جان اور میرے ابا جان کو دیوانہ کہتے تھے شاید مجھے بھی پیٹھ پیچھے دیوانہ کہتے ہوں گے مگر ہم دیوانے نہیں ہیں۔ دیوانے تو مجنوں اور فرہاد جیسے عاشق تھے جنہوں نے محبت کے نام پر اچھی بھلی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ میں اپنی دھن کا پکا ہوں۔ ایک طویل مدت کی محنت اور جدوجہد کے بعد میں نے قیامت تک زندہ رہنے والی دوا بنائی ہے اور اس کا فارمولا میری یادداشت میں محفوظ ہے۔"

یہودی جیمس نے خوشی سے کانپتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر عظیم صدیقی! میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ تم اس آبِ حیات کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہوں۔"

ہارڈی اور سوسن چونک کر بوڑھے جیمس کو دیکھا لیکن عظیم صدیقی مسکراتا ہوا شیشے کے ایک شوکیس کی طرف چلا گیا اور اس میں صراحی کو حفاظت سے رکھنے لگا۔ جیمس بڑی بے تابی سے بولی بڑھانے لگا۔

"دو لاکھ ڈالر لے لو....."

عظیم صدیقی جواب میں قہقہے لگانے لگا۔

"تین لاکھ۔ چار لاکھ۔ تم ہی کہو کہ اس کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟"

اس نے بدستور ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی کوئی قیمت نہیں ہے تم اپنی تمام دولت بھی میرے قدموں پر رکھ دو تو بھی میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ میں اسے خود ہی نوش کروں گا اور امر ہو جاؤں گا پھر تا قیامت اس دنیا

کی حسین لڑکیوں سے شادی کرتا رہوں گا ۔ اس بندر کی طرح جو اس کٹہرے میں ستر سال سے عیش کر رہا ہے ایک بندریا مر جاتی ہے تو دوسری آجاتی ہے اسی طرح میری ایک بیوی اپنی طبعی عمر گزار کر مر جائے گی تو دوسری آجائے گی یعنی بیویاں مرتی جائیں گی اور ان سے ہونے والی اولاد بڑھتی جائے گی ۔ چند صدیوں میں اس زمین کے چپے چپے پر صرف میرے ہی بچے ہوں گے ۔ اس وقت میں اس دنیا کے آدمیوں کا واحد باپ کہلاؤں گا ۔"

" پھر یہ کہ میں صرف زمین پر نہیں رہوں گا ، چاند پر بھی جاؤں گا اور وہاں ایک نئی دنیا قائم کروں گا ۔ دنیا بھر کے اخبارات میری تصویریں شائع کریں گے ۔ اپنے گھروں میں مسیح کی جگہ میری تصویریں لگایا کریں گے اور مجھے اپنا ایوڈرین باپ سمجھ کر میری پوجا کرتے رہیں گے ۔"

اس کی باتیں ہارڈی میین کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں ۔ ایک ایشیائی باشندہ سائنسی دوڑ میں اس سے بازی لے جائے یہ بات ناقابل برداشت تھی ۔ اس اینچ وتاب کھاتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ضرور اس آبِ حیات کو حاصل کرے گا ۔ عظیم صدیقی کو موقع نہیں دے گا کہ وہ اسے نوش کر سکے لیکن اس وقت اس نے اخلاقاً مسکراتے ہوئے کہا ۔

" ڈاکٹر عظیم صدیقی ! تم واقعی عظیم ہو میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں ۔"

" شکریہ ۔" عظیم صدیقی نے کہا ۔ " میرے دوستو ! کل کی تاریخ بہت اہم ہے یعنی کل کی صبح میں تم لوگوں کو کل صبح یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں ۔ کل صبح تک یہ آبِ حیات استعمال کے قابل ہو جائے گا میں تم لوگوں کے سامنے اسے نوش کروں گا تاکہ اخباری رپورٹروں کو تم بھی یہ بیان دے سکو کہ عظیم صدیقی ایک عظیم سائنسدان ہے ۔"

سوسن اس کی باتیں سن رہی تھی اور کبھی اسے اور کبھی شوکیس کو دیکھ رہی تھی جہاں آبِ حیات رکھا ہوا تھا پھر وہ ایک ادائے ناز سے مسکراتی ہوئی عظیم صدیقی کے پاس آئی اور اسے قاتلانہ انداز سے دیکھتی ہوئی بولی ۔

" میری جان عظیم ! تم نے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی ۔ اتنی زبردست

کامیابی پر محض زبانی مبارکباد دینا ایک طرح کی کنجوسی ہے میں کنجوس نہیں ہوں میں بڑی فراخدلی سے مبارکباد دینا چاہتی ہوں ۔ زبان سے نہیں اپنے گلابی ہونٹوں کی حرارت سے ......"

یہ کہتے ہوئے وہ عظیم صدیقی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پنجوں کے بل اٹھ گئی سوسن کے شگفتہ چہرے کو اپنی سانسوں کے قریب دیکھ کر عظیم صدیقی نے جذباتی لہجے میں کہا ۔

" واقعی ۔ یہ مبارکباد کا سب سے خوبصورت انداز ہے میں چاند کی دنیا میں جانے کے بعد مبارکباد دینے کا یہی طریقہ رائج کروں گا ۔"

اس کے بوڑھے ہونٹ سوسن کے جوان لبوں میں پیوست ہو گئے اس طویل بوسے کے دوران وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی ۔

" بے وقوف ڈاکٹر ! جس طرح تم ان ہونٹوں کے قریب آئے ہو اسی طرح آبِ حیات کا وہ لبریز جام بھی ان لبوں کو چومنے آئے گا ......"

بندر ان کی طرف دیکھ رہا تھا کھکھیا رہا تھا اور اچھل اچھل کر اور چیخ چیخ کر کسی خطرے کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ۔

آدھی رات گزر چکی تھی ۔ لیبارٹری میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا جس کی روشنی میں ہر چیز مٹی مٹی سی نظر آ رہی تھی ۔ ڈاکٹر لیبارٹری بند کرتے وقت بندر کی خاطر زیرو پاور کا بلب روشن رکھتا تھا اس وقت بندر اپنی بندریا کے ساتھ مزے کی نیند سو رہا تھا ۔ پھر اچانک ہی کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی ۔

ایک سایہ لیبارٹری میں حرکت کر رہا تھا ۔ وہ اچھل کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں ملنے کے بعد غور سے دیکھنے لگا ۔

سیاہ رنگ کے اسکرٹ اور بلاؤز میں سوسن ہارڈی کے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی وہ لیبارٹری کے وسط میں آ کر چند لمحوں تک دم سادھے کھڑی رہی اور گہری نظروں سے چاروں طرف

کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر وہ قدم جما کر آہٹ پیدا کئے بغیر شیشے کے شوکیس کے پاس آئی اور اسے کھول کر آبِ حیات کی صراحی کو باہر نکال لیا۔

سُرخ سیال کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیاتِ جاوداں کی مسرتوں سے چمکنے لگیں۔ اس نے صراحی کو میز پر رکھ کر اپنے وینٹی بیگ سے شیشے کی دو نلکیاں نکالیں۔ ایک نلکی میں سُرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری نلکی بالکل خالی تھی۔

وہ صراحی کے آبِ حیات کو نلکی میں ڈالنے لگی۔ جب صراحی کا آخری قطرہ بھی نلکی میں پہنچ گیا تو اس نے نلکی کو اچھی طرح بند کر دیا اور پہلی نلکی کے سُرخ سیال کو خالی صراحی میں اُنڈیل دیا۔

اس حسین عورت کے میٹھے لبوں پر کڑوی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے صراحی کو پہلے کی طرح شوکیس میں بند کر دیا۔ پھر شیشے کی دونوں نلکیوں کو اپنے وینٹی بیگ میں رکھ کر وہ سبک خرامی سے چلتی ہوئی کٹہرے کے پاس آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

"پُور منکی انکل تم اپنے مالک کا حشر دیکھ لینا۔ اس نے قیامت تک زندہ رہنے کی دوا بنائی تھی لیکن اب اس صراحی کی دوا کو پی کر وہ قیامت کے دن ہی آنکھیں کھول سکے گا۔ میں اسی وقت اس دوا کو نوش کر سکتی ہوں لیکن ڈاکٹر نے اُسے پینے کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے اسی وقت مجھے نوش کرنا چاہئے ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو۔ کل میں یہاں آؤں گی اور اس کا طریقہ استعمال دیکھوں گی ویسے یہ آبِ حیات میں مفت نہیں لے جا رہی ہوں میں نے اس کے لئے ایک بوسے کی قیمت ادا کی ہے یہ احمق مرد نہیں جانتے کہ ایک عورت کا بوسہ بعض اوقات کتنا مہنگا پڑتا ہے ....."

یہ کہہ کر اس نے بندر کو ایک ہوائی بوسہ دیا۔ پھر فاتحانہ انداز سے چلتی ہوئی لیبارٹری سے چلی گئی۔

بندر بہت دیر تک اکڑوں بیٹھا رہا۔ وہ شاید اس حقیقت پر غور کر رہا تھا کہ انسان بھی اس کی طرح دوسروں سے چھیننے اور جھپٹنے کا عادی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بندر بلا جھجک کوئی بھی چیز چھین کر بھاگ جاتا ہے اور انسان اسی چیز کو دھوکے اور چالبازی سے حاصل کرتا ہے۔

آدھ گھنٹے کے بعد پھر ایک کھٹکا سا سُنائی دیا۔ لیبارٹری کے اندر دروازے کے قریب پھر ایک سایہ نظر آ رہا تھا جب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب سے گذرا تو بندر نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہارڈی مین تھا اپنے ملک کا عظیم سائنسدان۔ وہ بھی آبِ حیات چرانے آیا تھا وہ سائنسی دوڑ میں عظیم صدیقی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا اس لئے وہ عظیم صدیقی کی ایجاد پر اپنے نام کی چھاپ لگا کر شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے شوکیس سے صراحی نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے لانگ کوٹ کی جیب سے شیشے کی دو نلکیاں نکال کر انھیں زیرو پاور کی روشنی میں دیکھنے لگا ایک نلکی میں سُرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری نلکی بالکل خالی تھی۔

اس نے صراحی کے سیال کو خالی نلکی میں بھرنے کے بعد دوسری نلکی کے سیال کو صراحی میں انڈیل دیا اور اسے پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ دیا۔ پھر شیشے کی دونوں نلکیاں لانگ کوٹ کی جیب میں پہنچ گئیں۔

وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا کٹہرے کے پاس آیا اور اپنی ایک اُنگلی سے بندر کی ٹھوڑی کو اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرے بے زبان دوست! اب میں تمہارے ساتھ قیامت تک زندہ رہوں گا اور تمہارا مالک اس صراحی کے آبِ حیات کو پی کر ہمیشہ کی نیند سو جائے گا۔ اس آبِ حیات کو میں ابھی نوش کر سکتا ہوں لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اس صراحی کی دوا کو پینے سے پہلے کوئی تبدیلی کرنا چاہتا ہے یا نہیں اگر اس نے طبّی نقطۂ نظر سے کوئی اہم تبدیلی کی تو میں بھی اصلی آبِ حیات میں وہی تبدیلی لاؤں گا، پھر اُسے پی کر زندۂ جاوید ہو جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ ابدی زندگی کے نشے میں جھومتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بندر کی نیند اُچاٹ ہو گئی تھی اس لئے وہ جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تنہائی سے اُکتا کر بندریا کی جانب دیکھا۔ اس کی ستّر سالہ زندگی میں وہ دسویں بندریا تھی۔ اس کے آقا جانتے تھے کہ انسان اور بندر کی ضروریات ایک جیسی ہوتی ہیں شاید ڈارون نے درست کہا تھا کہ انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے انسان بن گئے ہیں لیکن ڈارون نے ارتقائی منزلوں کا ذکر کیا تھا

یہ نہیں بتایا تھا کہ تباہی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسان دوبارہ بندر بن سکتا ہے یا نہیں؟

کوئی ایک گھنٹے کے بعد پھر ایک بار کھٹکا سنائی دیا۔ بندر نے سلاخوں کے پیچھے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بوڑھا یہودی جیمس تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ لبادے میں چھپے ہوئے تھے جب اس نے میز کے قریب آ کر لبادے سے ہاتھ کو نکالا تو اس کی گرفت میں دو بوتلیں تھیں ایک بوتل میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری بوتل خالی تھی۔

پھر اس نے بھی وہی عمل دہرایا۔ صراحی کے سیال کو خالی بوتل میں بھر کر اس نے دوسری بوتل کے سرخ سیال کو صراحی میں انڈیل دیا اور صراحی کو پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ کر دونوں بوتلوں کو پھر لبادے میں چھپالیا۔

ابدی زندگی کی دوا مفت حاصل کرنے کی خوشی سے وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے بندر کے سامنے دانت نکال کر کہا۔

"میں بھی کتنا احمق ہوں۔ ڈاکٹر کو لاکھوں ڈالر دینے کیلئے تیار ہو گیا تھا۔ اب اے بندر کی اولاد! اپنی زبان سے اگر اپنے آقا کو بول سکتا ہے تو بول دینا ہے کہ اب اس صراحی میں زہر رکھا ہوا ہے میں یہ آب حیات مفت لے جا رہا ہوں اور اسے زہر بھی مفت دیئے جا رہا ہوں۔ میں کل آ کر اس کی موت کا تماشہ دیکھوں گا۔ ہی ہا ہی ہی ہی"

وہ دھیمے سروں میں ہنستا ہوا لیبارٹری سے چلا گیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور وہ بے چارا بندر کسی اداس فلسفی کی طرح سر پر ہاتھ رکھے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

دوسری صبح لیبارٹری پھر آباد ہو گئی۔ رات کی تاریکی میں جو لوگ عظیم صدیقی کے دشمن بن کر آئے تھے وہ اب دوست بن کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے لیکن اُن میں سوسن ہارڈے نہیں تھی عظیم صدیقی نے مسکراتے ہوئے ہارڈی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، آج تمہاری خوبصورت سیکرٹری نہیں آئی؟ ہائے انکل کے بوسے کی لذت

مجھے ابھی تک یاد ہے"

ہارڈی مین نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جائے لیکن یہ عورتیں آئینے کے سامنے میک اپ کرنے بیٹھتی ہیں تو پھر وقت کا خیال نہیں رکھتیں"

"بہر حال میرے لیئے وقت کی پابندی لازمی ہے" عظیم صدیقی نے شوکیس سے صراحی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ہارڈی اور جیمس کے دل دھڑکنے لگے۔ آج ایک عظیم سائنسدان ان کے زہر سے ہلاک ہونے والا تھا۔ انہوں نے آج تک کسی کو ایک طمانچہ بھی نہیں مارا تھا، لیکن ابدی زندگی کی خواہش انھیں قاتل بنا رہی تھی۔

ڈاکٹر عظیم صدیقی نے ریک کے مختلف سوراخوں میں لگی ہوئی شیشے کی نلکیوں میں سے ایک نلکی کو نکال کر کہا۔

"مسٹر ہارڈی! اس نلکی میں کونسا سیال ہے؟ اسے میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں نے اپنی ڈائری میں آب حیات کا جو فارمولا لکھ رکھا ہے، اس میں اس نلکی کا ذکر میں نے مصلحتاً نہیں کیا ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی کمی کے باعث میرے باپ دادا کو موت کے منہ میں جانا پڑا۔ اس کے صرف تین قطرے صراحی میں ٹپکا دیئے جائیں تو یہ آب حیات مکمل ہو جاتا ہے"

یہ کہہ کر اس نے تین قطرے صراحی کے سیال میں ٹپکا دیئے۔ پھر صراحی کو اچھی طرح ہلانے کے بعد اس مکمل آب حیات کو یا دوسرے لفظوں میں اس مکمل زہر کو ایک گلاس میں انڈیلنے لگا۔

ہارڈی اور جیمس دم سادھے کھڑے تھے۔ عظیم صدیقی نے گلاس اٹھا کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"آب حیات ...... ہاہاہا ...... آسمانی کتابیں کہتی ہیں کہ ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، سب بکواس ہے۔ میں موت کو شکست دے رہا ہوں، اور ابدی زندگی کا مزہ چکھ رہا ہوں"

یہ کہہ کر اس نے زہر کے جام کو ہونٹوں سے لگایا اور اسے غٹاغٹ پینے لگا۔

"اونگ ....." دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا۔ جام چھوٹ گیا اور ٹوٹ گیا۔ وہ ٹوٹنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے میز کا سہارا لیا، لیکن اس کے تمام جسم کے اندر ایسی آگ پھیل رہی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اوندھے منہ گر پڑا۔

وہ دم توڑ رہا تھا اور جیمس قہقہے لگا رہا تھا۔

"ہاہاہا..... میرے دوست! کاش کہ تم میری بات مان لیتے اور میرے ہاتھوں اسے فروخت کر دیتے، مگر تمہاری حماقتوں کا شکریہ..... تمہارا ایجاد کردہ آبِ حیات مجھے مفت حاصل ہو گیا ہے۔ پچھلی رات میں نے اُسے صراحی سے نکال کر اس میں زہر بھر دیا تھا۔ ہاہاہاہا....."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عظیم صدیقی ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن ہارڈی اب جیمس کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جیمس نے اس سے پہلے اگر صراحی کا آبِ حیات نکالا تھا یا اس کے بعد، اگر وہ پہلے آیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جیمس سے دھوکا کھانے والا ہے۔

جیمس اس وقت اسی خاص نلکی سے تین قطرے ایک بوتل میں ٹپکا رہا تھا۔ ہارڈی نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم پچھلی رات یہاں آئے تھے؟"

"ہاں!" جیمس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کس وقت؟"

"صبح ہونے سے کوئی دو گھنٹے پہلے....."

ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیمس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ بیہودہ اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گلاس میں زہر کو انڈیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے جھوم کر کہنے لگا۔

"میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب میری دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار لیا۔

"آہ.....!" ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ تھوڑی سے نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سہلانے لگا کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کلیجے تک کو چھیلتی جا رہی تھی پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور ایک کٹی ہوئی شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے حقارت سے دونوں لاشوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیوقوف لالچی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سائنسدان تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیئے تھا.....! ڈاکٹر عظیم میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے راستے بھی ہموار کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی۔

وہ حاصل کئے ہوئے آبِ حیات میں اُسی خاص نلکی سے تین قطرے ٹپکانے لگا۔

"یہ ہے اصلی آبِ حیات۔ میں ہوں عظیم سائنسدان جس نے اس آبِ حیات کا فارمولا بنایا ہے ڈاکٹر عظیم گمنامی کے اندھیرے میں جا چکا ہے اب میری شہرت کا دور آیا ہے"

یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹاغٹ پی گیا۔

بندر دیکھ رہا تھا..... دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو گلے لگاتا ہے اس کے سامنے ہارڈی بھی سسک کر دم توڑ چکا تھا۔

تین لاشیں ادھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار رہی۔ موت نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔

پھر اچانک ہی لیبارٹری کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور سوسن ہارڈے تیزی سے اندر آئی لیکن تین لاشوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی کیونکہ اس نے صرف عظیم صدیقی کی موت کی توقع کی تھی۔ وہ محض اس لئے دیر سے آئی تھی کہ اپنے دیئے ہوئے زہر سے ڈاکٹر کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی عورت بہت رحمدل ہوتی ہے۔ جسے قتل کرتی ہے اس کے تڑپنے کا منظر نہیں دیکھ سکتی۔

وہ تین لاشوں کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ اس نے سوچا کہ شاید ان تینوں نے اس زہر کو

بانٹ کر پیا ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ابدی زندگی کا لالچ کسے نہیں ہوتا، وہ اسی لالچ میں مر گئے ہیں۔

اس نے سوچا یہ اچھا ہی ہوا۔ اب کوئی یہ الزام عائد نہیں کرے گا کہ سوسن ہارڈلے نے اصلی آبِ حیات کو چرا کر اس لیبارٹری سے ایک نئی زندگی کی ابتداء کی ہے۔

اس خیال سے مطمئن ہو کر اس نے اپنے وینٹی بیگ سے شیشے کی ایک نلکی نکالی جس میں ڈاکٹر کا تیار کردہ ادھورا آبِ حیات بھرا ہوا تھا اس خوبصورت ناگن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے علاوہ بھی ایک خاص نلکی ہے جس سے تین قطرے اس ادھورے آبِ حیات میں ٹپکائے جاتے ہیں وہ دیر سے پہنچی تھی اس لیئے ڈاکٹر کے فارمولے کے آخری آئیٹم کو نہ سمجھ سکی تھی۔ اس نے نلکی کھول کر ڈاکٹر کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر، میری جان! یہ آبِ حیات تیرے مقدر میں نہیں تھا۔ یہ میری سدا بہار جوانی کی ضمانت بن گیا ہے اب میں کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ میری زلفیں اسی طرح ریشم کی مانند ملائم رہیں گی۔ میرا جسم اسی طرح شاداب رہے گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ جوان رہوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے گلابی ہونٹوں سے زہر کے جام کو لگا لیا۔

"کھی کھی کھی ۔۔۔۔" بندر کٹہرے کی سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا اور دانت نکال کر کھکھیانے لگا۔ اس کی آواز کے ساتھ سوسن کی کراہیں اور ہچکیاں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ سائنسی آلات اور شیشے کے مرتبان اس کی زد میں آ کر چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے وہ اپنی بھاگتی ہوئی زندگی کو پکڑنے کے لئے لیبارٹری کے در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے آگے گر پڑی۔ چوتھی لاش کا اضافہ ہو گیا۔

لیبارٹری میں سناٹا چھا گیا۔ بندر اکڑوں بیٹھا اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھے ایک فلسفی کی طرح سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

انسان اسی طرح دوسروں کی زندگیاں چھینتا رہے گا اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھوتا رہے گا۔ وہ سب مر گئے اور وہ بندر انسانوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مرنے کا اور اس دنیا کے فنا ہونے کا تماشہ دیکھنے کے لیئے زندہ رہ گیا۔ لیبارٹری سے باہر وقت گزرنے لگا۔ سال گزر گئے صدیاں بھی گزرنے لگیں۔ وقت کے ہاتھوں نے اس لیبارٹری کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اسے کھنڈر بنا کر آثارِ قدیمہ کے کھاتے میں لکھ دیا۔ وہ بندر پہلے چڑیا گھر پہنچایا گیا۔ پھر عجائب گھر بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن موقع پا کر عجائب گھر سے فرار ہو گیا۔ کوئی نہ جان سکا کہ وہ تاقیامت بھٹکنے کے لیئے کہاں چلا گیا ہے۔

اس عرصے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا تھا۔ کتنے ہی برِاعظم سمندر کی تہہ میں چلے گئے تھے اور کتنے ہی سطحِ سمندر پر اُبھر آئے تھے۔ اس وقت بھی انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کو قتل کرنے کا عمل جاری تھا۔ ایک انسان دوسرے انسان کو، ایک مذہب دوسرے مذہب کو اور ایک قوم دوسری قوم کو کبھی زندہ سلامت نہیں دیکھنا چاہتی۔ جب سے انسان نے زندہ رہنے کے تہذیبی اصول سیکھے ہیں تب سے دوسروں کو مارنے کے تدریجی حربے بھی کامیابی سے آزماتے آئے ہیں۔ ان دنوں پستول اور بندوقیں پرانے زمانے کی چیزیں ہو گئی تھیں، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے توڑ دریافت کر لیئے گئے تھے انسانوں کو جدید طریقوں سے مارنے کے لئے لیزر شعاعیں بھی کام میں لائی گئیں لیکن ہوتا یہ تھا کہ ایک انسان ہلاک کرنے کا نیا ہتھیار ایجاد کرتا تھا اور دوسرا اس سے بچاؤ کی تدابیر کر لیتا تھا۔

آخر چند بڑے بڑے دماغوں نے یکجا ہو کر سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دنیا کی آبادی کم کرنے کے لیئے دوسروں کو جبراً ہلاک نہیں کرنا چاہیئے۔ کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہیئے کہ لوگ خود ہی راضی خوشی مر جایا کریں۔

اس مقصد کے لیئے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ اس مطالعہ سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی بدل گئی۔ کبھی وہ شہادت کا درجہ حاصل کرنے میدانِ جنگ میں جاتا تھا اور اپنی خوشی سے مر جاتا تھا۔ کبھی مارے غیرت کے جان پر کھیل جاتا تھا۔ مگر

اب اس کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ مرنے مارنے والے جذبات اور احساسات کی طرف جھکتا بھی نہیں تھا۔

پھر ایک عالم فاضل عمر دراز مورخ نے کہا کہ انسان کی فطرت بدل سکتی ہے لیکن جو چیز اسے ورثے میں ملتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے نہیں جاتی۔ وہ چیز کیا ہے؟ وہ عورت ہے۔ عورت پہ مرنا۔ اپنی جھر جھر کر راضی خوشی مرنے کی عادت اس کی گھٹی میں پڑی ہے مرنے کا یہ دستور بابا آدم سے شروع ہوا اور ہزارہا سالوں کے بعد بھی جاری و ساری ہے۔

اس نکتے پر پہنچ کر اس دور کی حسین و جمیل عورتوں کو ایک نئے ہتھیار سے آراستہ کیا گیا۔ یوں تو وہ ہتھیار عورتوں کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ صرف اس میں دھار پیدا کی گئی۔ اسے استعمال کرنے کے نت نئے طریقے سکھائے گئے ان کی غزالی آنکھوں ——— میں کچھ ایسا الیکٹرونک سسٹم لگایا کہ وہ حسینائیں جسے آنکھ مارتیں، وہ ایک ہائے کے ساتھ مر جاتا پہلے لوگ شاعرانہ انداز میں مرتے تھے، اب بھی جان سے مر کر اس دنیا سے رخصت ہونے لگے۔

اس طرح انسان گھٹنے لگے چونکہ وہ راضی خوشی مر رہے تھے اس لیے دنیا کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد بڑے بڑے دماغوں کو اپنی ایک غلطی کا علم ہوا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ عورتیں قاتل تھیں اور مرد مقتول، اس طرح مردوں کی تعداد گھٹ رہی تھی اور عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس غلطی کی تلافی کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑے بڑے دماغوں نے ایک متفقہ فیصلے پر عمل کرتے ہوئے عورتوں کے جسمانی نظام سے وہ خانہ نکال کر پھینک دیا جہاں مادہ تولید پناہ لیتا ہے اور بچے پرورش پاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدائش کا عمل رک گیا۔

قدرت کے نظام میں ذرا بھی تبدیلی ہو تو انسان کی تہذیب یکسر بدل جاتی ہے اب کوئی عورت مہذب ماں نہیں بنتی تھی۔ اب عورت محض داشتہ تھی کیونکہ جب عورت وارث نہ پیدا کرے اور ایک نسل کو آگے نہ بڑھائے تو پھر بیوی کے رشتے کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اب

عورت صرف اس مصرف کے لئے رہ گئی کہ وہ رات کو ساتھ سوئے اور دن کو بھلا دی جائے۔

نصف صدی کے بعد مردوں اور عورتوں کی تعداد بہت ہی کم ہو گئی۔ ہر ملک میں لوگ صرف سینکڑوں کی تعداد میں رہ گئے۔ کچھ بڑے دماغ اپنی عمر گزار کر مر گئے جو بچ گئے انہیں لوگوں نے مار دیا۔ کیونکہ ان کی ہی وجہ سے یہ وقت دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اب اس دنیا میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ماں بن سکتی اور اس ویران ہونے والی دنیا کو پھر ننھے منے بچوں سے آباد کر سکتی۔

کون ہے ایسی عورت؟

اس دنیا کے بچے کھچے لوگ ایسی کسی عورت کو تلاش کرنے کے لئے ملک ملک کی خاک چھاننے لگے لیکن ایسی کوئی عورت نہ ملی۔ اس دنیا میں جو عورتیں رہ گئی تھیں، وہ گھسے پٹے ریکارڈ کی طرح تھیں، جن میں سے پرانے جانے پہچانے سر نکلتے تھے مگر کسی کے اندر سے ممتا کی مترنم آواز نہیں آتی تھی۔

پھر ایک نجومی نے بتایا کہ ایسی ایک عورت ابھی اس دنیا میں موجود ہے جو ماں بن سکتی ہے اور اس دنیا کی آبادی کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

اس نجومی نے اپنے علم کی قوت سے ہزاروں سال پیچھے ماضی کی تہہ در تہہ میں جھانک کر دیکھا تو اسے زمین کے ایک خطے میں منوں مٹی کے تلے ایک تابوت نظر آیا۔ اس نجومی نے کہا۔

”میں اپنے علم کی آنکھ سے ایک ایسی حسین دوشیزہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے حسن کی مثال ہماری دنیا کی کوئی عورت پیش نہیں کر سکتی۔ میں اپنی سمعی قوت سے بتا سکتا ہوں کہ اس تابوت میں اس کی سانسوں کی سرگم گونج رہی ہے وہ ہزاروں سال سے زندہ ہے اور زندہ رہے گی“

ایک سائنس داں نے بے یقینی سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک عورت ہزاروں سال سے کیسے زندہ ہے؟ ہم نے حیرت انگیز سائنسی ترقیاں کی ہیں۔ سمندر کی تہہ سے ہم آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچے ہیں۔ ہم کائنات کے کتنے ہی اسرار کو بے نقاب کر چکے ہیں قدرت کے صرف دو راز ایسے ہیں جہاں تک ہم نہیں پہنچ سکے

ایک تو یہ کہ ربڑ کی مصنوعی عورت سے اصلی بچے پیدا کرنا۔ اگرچہ ایسی عورت سے بچے پیدا ہوئے تھے مگر وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ اس کوشش میں ہمیں ناکامی ہوئی۔ ہماری دوسری کوشش یہ تھی کہ ہم ابدی زندگی حاصل کریں۔ ایسی کوششیں ہر زمانے میں ہوتی رہی ہیں مگر آج تک کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ پھر آج کیسے یقین کریں کہ ایک عورت ہزاروں سال سے مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہے اور ہوا اور روشنی کے بغیر کچھ کھائے پیئے اب تک زندہ ہے؟"

نجومی نے جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا کہ وہ کیسے زندہ ہے البتہ منطق سے سمجھا سکتا ہوں۔ مچھلی روشنی اور ہوا کے بغیر سمندر کی تہہ میں زندہ رہتی ہے۔ ایک کیڑا روشنی اور ہوا کے بغیر مٹی کی تہہ میں زندہ رہتا ہے دونوں کو زندگی کے لئے قدرتی طور پر خوراک ملتی رہتی ہے اس دوشیزہ میں بھی کیڑے اور مچھلیوں کی سی خاصیتیں ہیں۔ قدرت کا اپنا بھید ہے جسے ہم اور تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم نے آج تک جتنی بھی سائنسی ترقیاں کی ہیں وہ دوسروں کو ہلاک کرنے اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے کی ہیں۔"

نجومی کے دلائل سننے کے بعد وہ اس مقام پر گئے جہاں وہ تابوت دفن کیا گیا تھا۔ دنیا کی آبادی بہت ہی مختصر تھی اور وہ تمام مختصر آبادی اس جگہ آکر جمع ہو گئی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں لیکن کوئی بچہ یا نوجوان نہیں تھا۔ کیونکہ نصف صدی سے پیدائش کا عمل رکا ہوا تھا۔ پچاس برس پہلے جو جوان تھے وہ اب اسی نوے سال کے بوڑھے ہو گئے تھے۔

وہ سب اس جگہ کو باری باری کھود رہے تھے کہ بڑھاپے کی وجہ سے مسلسل کدالیں نہیں چلا سکتے تھے۔ ذرا سی دیر میں تھک کر ہانپنے لگتے تھے۔ پھر یہ کہ ہزاروں سال کی مدت میں اس جگہ مٹی اور پتھروں کا اتنا ڈھیر جمع ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹی سی پہاڑی سی نظر آتی تھی۔

اس پہاڑی کے اطراف انسانوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ رات کے وقت کھدائی کی رفتار سست ہو گئی۔ سست رفتاری کے باوجود یہ یقین تھا کہ صبح تک وہ تابوت برآمد ہو جائے گا۔

اس رات چند سمجھدار اور چالاک انسان ایک خیمے میں اگر کچھ خاص قسم کے مشورے کرنے

جمع ہو گئے۔ تیل کا کنواں ہو یا سونے اور ہیرے کی کان ہو، یا عورت کی قبر ہو، جب بھی کوئی نایاب چیز کھود کر نکالی جاتی ہے تو عالمی سیاست میدان عمل میں آجاتی ہے۔ صبح برآمد ہونے والی شے بھی ان کے لئے ایک نایاب عورت تھی۔ ایک ایسی عورت جو اس دنیا کے نئے نئے انسانوں کو جنم دے سکتی تھی۔

اس خیمے میں چار بڑے آدمی یا چار بڑی طاقتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک طاقت نے کہا۔

"اس دنیا کی پرانی آبادی تقریباً ختم ہو چکی ہے جو رہ گئے ہیں وہ اولاد پیدا کئے بغیر مر جائیں گے۔ اب نئی دنیا کے نئے انسان اس عورت کی کوکھ سے جنم لیں گے جو صبح ہمیں دستیاب ہونے والی ہے لہٰذا ہمیں آپس میں فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ وہ عورت ہم میں سے کس کے بچے کی ماں بنے گی؟ یعنی آئندہ دنیا کے آئندہ آدمیوں کا باپ کون بنے گا؟"

"میں بنوں گا۔" دوسری طاقت نے کہا۔ "کیونکہ میں ہی ایک بڑی طاقت ہوں۔"

تیسری اور چوتھی طاقتوں نے بھی یہی دعویٰ کیا کہ وہ اس دنیا کے بڑے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف ان کی اولاد پھیلے گی اور پھلے پھولے گی۔ ایک طاقت نے کہا۔

"ہم میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ ہم آئندہ دنیا کے باپ بنیں۔ لیکن ہم چار طاقتوں نے اگر الگ الگ اپنے متعلق خود غرضی سے فیصلہ کیا تو پھر ہمارے درمیان جنگ چھڑ جائے گی ہم اس دنیا کی ابتدا سے لڑتے آئے ہیں۔ اس لڑائی جھگڑے کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے ہم تعداد کے لحاظ سے برائے نام رہ گئے ہیں۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو ہم سب مارے جائیں گے۔ اس دنیا میں ہم انسانوں کا یہ آخری وجود ہے۔ اس کے بعد یہاں ایک بھی آدمی کا بچہ نظر نہیں آئے گا، لہٰذا دانشمندی یہ ہے کہ ہم آپس میں اس ایک عورت کو بانٹ لیں پہلے ہم میں سے کسی ایک کے پاس رہے گی۔ ایک سال کے اندر جب وہ بچے کا باپ بن جائے گا تو پھر وہ عورت دوسری طاقت کے پاس چلی جائے گی۔"

دوسری طاقت نے سر ہلا کر تائید کی۔

"ہاں ہزاروں سال پہلے جب کہ دنیا آباد ہوئی تھی اور جب انسان تہذیب کا مطلب اور

شرم وحیا کے معنی نہیں جانتا تھا، ان دنوں بھی عورت مختلف وقتوں میں مختلف قبیلوں کے سرداروں کے پاس پہنچ کے بچے پیدا کرنے جایا کرتی تھی۔ ہماری اس دنیا کا جو ضابطہ تھا۔ انتہا میں بھی وہی بے شرم تہذیب لوٹ آئی ہے مگر کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے۔ ابھی تو یہی دانشمندی ہوگی کہ وہ عورت ہر سال ہم میں سے ہر طاقت کے پاس رہے۔ یہ اچھا ہے اس دنیا میں صرف ہم چار طاقتوں کی اولادیں رہیں گی۔ وہ چاروں اس دانشمندانہ فیصلے پر متفق ہو گئے۔ صبح وہ کھودنے والے زمین کی تہہ میں تابوت تک پہنچ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا کہ تابوت نظر آ گیا ہے صرف اتنا ہی نہیں، مزید حیرانی اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس تابوت کے اندر سے ٹھہر ٹھہر کر طبلہ بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر کتنے ہی ہاتھوں نے اس تابوت کو سنبھال سنبھال کر اٹھایا اور اسے چار طاقتوں کے درمیان لا کر رکھ دیا۔ تابوت کے اوپر انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس تابوت کا اوپری حصہ کھل گیا۔ سب نے بیقراری سے آگے بڑھ کر دیکھا۔ اندر ایک حسین مہ جبیں اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ برسوں زمین کی تہہ میں رہنے کے بعد اب اس کی آنکھیں صرف اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں اس لئے وہ آنکھیں روشنی کو برداشت نہیں کر رہی تھیں۔

چاروں طاقتیں اس کے آس پاس بیٹھ گئی تھیں اور اسے بڑی نرمی سے چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ ایک نے کہا۔

”تم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کیوں رکھ لئے ہیں؟ اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ ہم تمہاری خوبصورت آنکھوں میں جھانکنا چاہتے ہیں۔“

شے می نے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ اس نے ذرا سا آنکھیں کھولیں، اور مخروطی انگلیوں کی چلمن سے پہلی بار اس دنیا کے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ عجیب قسم کے لوگ تھے، ان میں سے کسی کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی نہیں تھی وہ سب بوڑھے اور وقت کے طمانچے کھائے ہوئے جھریوں دار چہرے تھے انہیں دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ شے می نے آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم کون ہو؟ میں اس وقت کہاں ہوں؟ مجھے کہیں اندھیرے میں لے چلو، یہ روشنی میری

آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔“

انہوں نے اسے تابوت سے اٹھا کر ایک اسٹریچر پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک عالیشان محل کی ایئرکنڈیشنڈ خوابگاہ میں پایا۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ خوابگاہ میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں اس نے چند بوڑھی عورتوں کو دیکھا جو اسے غسل کرانے اور نیا لباس پہنا کر دلہن بنانے آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر شے می نے کہا۔

”میں نے وہاں بھی بوڑھے دیکھے، یہاں بھی بوڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔ آخر میں کس دنیا میں آ گئی ہوں کہ کوئی نوجوان چہرہ نظر ہی نہیں آتا۔“

اس کے جواب میں وہ بوڑھیاں اسے عجیب و غریب باتیں بتانے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ نصف صدی سے وہاں کسی نے نوزائیدہ بچے کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ اس دنیا میں جتنے میٹرنٹی ہوم ہیں، وہاں پالتو کتوں اور بلیوں کے بچے جنم لیتے ہیں۔ بے بی فوڈ تیار کرنے والی جتنی صنعتیں تھیں اب وہ بابا فوڈ تیار کرتی ہیں۔ وہاں کی عورتیں پچاس برس سے کسی بچے کو سینے سے لگانے اور لوری گانے کیلئے ترس رہی ہیں۔ اس دنیا کے چار بڑوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اگر قانون قدرت کے خلاف عورتوں کی کوکھ اجاڑ دی جائے تو یہ دنیا کس طرح اجڑ جاتی ہے۔

شے می کو غسل کرایا گیا۔ اسے رفتہ رفتہ یہ بات معلوم ہوتی گئی کہ اتنی بڑی دنیا میں وہی صرف ایسی عورت ہے جس کی کوکھ سلامت ہے اور وہ اس دنیا کو نئے سرے سے آباد کر سکتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا کی آبادی اب صرف چند سو یا ہزار افراد پر مشتمل ہے جن میں نصف سے زیادہ عورتیں ہیں، باقی بوڑھے مرد ہیں اور وہ لوگ بھی رفتہ رفتہ موت کی طرف رینگتے جا رہے ہیں۔

غسل کے بعد شے می کو اس دور کا بہترین نیم ٹرانس پیرنٹ لباس پہنایا گیا۔ پر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ پھر وہ بوڑھی عورتیں اسے اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے بیڈ روم میں لے گئیں اور اسے پھولوں کی سیج پر بٹھا کر آ گئیں۔

شے می سیج پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھنے لگی وہ بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ خوابگاہ تھی ۔ دیواروں پر عریاں اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تصویریں آویزاں تھیں ۔ ہزاروں برس تک مٹی کی تہہ میں ساکت و جامد رہنے کے بعد پہلی بار شے می کے بدن میں انگڑائیاں مچلنے لگیں ، وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خمار چھا رہا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد اس دنیا کا پہلا بڑا خوابگاہ میں داخل ہوا ۔ اس کے چہرے پر گھبرائی ہوئی سی مسکراہٹ تھی پھولوں کی سیج پر سترہ سال کی ایک دوشیزہ کو دیکھ کر وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آیا اور اس کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر محبت بھرے مکالمے ادا کرنے لگا ۔

زمین کی تہہ میں آتش فشاں کی طرح پگھلنے والی شے می کو مکالموں سے دلچسپی نہیں تھی اس نے اپنی مرمریں باہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں ۔ پھر اپنے لبوں کو اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا ۔ بوسے کی پہلی منزل بڑی صبر آزما تھی پہلے لب سے لب ملے پھر زبان سے زبان اس کے بعد بوسے کی شدت سے جیسے ہی دانت سے دانت ٹکرائے اس بوڑھے کی بتیسی باہر آگئی ۔ اس نے فوراً ہی دانتوں کے چوکھٹے کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کہا ۔

"کک ۔ کوئی بات نہیں ۔ مم ۔ میں انہیں ایک طرف رکھ دیتا ہوں "

وہ وہاں سے اٹھ کر میز کے پاس گیا اور نقلی دانتوں کو وہاں رکھ کر واپس آگیا ۔ اتنی دیر میں وہ پسینہ پسینہ ہو گیا تھا ۔

خوابگاہ کے باہر، اس محل کے باہر فوری طور پر ایک میٹرنٹی ہوم قائم کر دیا گیا تھا ۔ تجربہ کار ڈاکٹروں اور نرسوں کی تقرری ہو چکی تھی ۔ پرانے صنعتکاروں کو بے بی فوڈ بنانے کے لائسنس جاری کر دیئے گئے تھے اور بوڑھی عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھ کر بھولی ہوئی لوریاں یاد کر رہی تھیں ۔

تمام لوگ نئی نسل کو خوش آمدید کہنے کے انتظامات میں مصروف تھے لیکن محل کے اندر سناٹا تھا ۔ آدھی رات کے بعد اس دنیا کے پہلے بیڈروم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا شے می جھنجلا کر "اونہہ" کہتی ہوئی باہر نکلی اور اپنی خوابگاہ میں آکر اور ذرا آنسو بہا کر پھر تکیے کو سینے سے لگا کر سو گئی ۔

وہ پہلا بڑا ۔ ندامت سے مر گیا ۔ سچ مچ مر گیا ۔ اس دنیا کو تباہ کرنے کے بعد جب اولاد نہ ہو، جب وہ ایک عورت کو فتح نہ کر سکے اور جب ایک عورت "اونہہ" کی ہتک آمیز برچھی سینے میں اتار کر چلی جائے تو اسے شرم سے مر جانا چاہیئے تھا ، اس لئے وہ مر گیا ۔

شے می دوسرے بڑے کے حصے میں آگئی ۔

دوسرا بڑا زیادہ ہی سمجھدار تھا کیونکہ وہ اپنے بڑھاپے اور شے می کی جوانی کے درمیان جو طویل فاصلہ ہے ، اس فاصلے کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ اتنا طویل سفر نہیں کر سکے گا ۔ اس نے شے می کو بہلا پھسلا کر رکھا تھا اور اپنے خاص آدمیوں کو کسی ایسے شخص کی تلاش میں روانہ کر دیا جو اس دنیا کے بوڑھوں میں کم بوڑھا ہو ، یعنی قدرے جوان ہو اور شے می کے بچوں کا باپ بن سکتا ہو ۔

منصوبہ یہ تھا کہ خفیہ طور سے باپ کوئی بنے گا ۔ پھر اس گمنام باپ کو ہلاک کر دیا جائے گا ، اس طرح باپ کا ٹائیٹل نیم اس دنیا کے دوسرے بڑے کو مل جائے گا ۔

دوسرے دن اس کے خاص آدمی دو ایسے بوڑھوں کو پکڑ لائے جو دوسروں کے مقابلے میں کم عمر تھے اب سے پچاس برس پہلے وہ نوزائیدہ بچے تھے اب وہ پچاس برس کے ہو گئے تھے ۔ انہیں مکمل بوڑھا نہیں کہا جاسکتا تھا ۔ وہ ادھیڑ عمر کے تھے اور کافی صحت مند نظر آتے تھے ۔

ان کی صحت کو دیکھ کر دوسرے بڑے کو خطرہ لاحق ہوا ۔ اگر شے می اُن میں سے کسی ایک کو پسند کر لیتی تو پھر اس دنیا کے بڑوں کی ملکیت بننے سے انکار کر دیتی ۔ کیونکہ عورت کسی بڑے کی بڑی بن کر کھوکھلی دنیا کی حکمرانی نہیں چاہتی ۔ وہ ایسی مسرتوں کی تکمیل چاہتی ہے جو اس کے اندر سے پھوٹتی ہیں ، وہ ایک جوانمرد کی آرزو کرتی ہے ، اور اسی کی آغوش میں جینا اور مرنا چاہتی ہے صرف اتنا ہی نہیں ، وہ اپنے بچوں کے باپ کا نام بھی فخر سے لیتی ہے اور کسی بوڑھے کے وجود پر باپ کا جھوٹا لیبل لگا کر اپنی آئندہ نسل کی توہین نہیں کرتی ۔

دوسرا بڑا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا ۔ اس نے مجبور ہو کر تیسرے بڑے اور چوتھے بڑے سے مشورہ کیا ۔ وہ بھی حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ گئے اور اپنی کمزوریوں کا بھی اعتراف کر لیا ۔

پھر انہوں نے سوچا کہ جب ہم سے ہماری اولاد نہیں ہو گی تو پھر یہ دنیا رہے یا انسانوں سے خالی ہو جائے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا لہذا اس دنیا کو خالی ہو جانے دو۔ ہم یہ تو ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ کسی دوسرے کی اولاد اس دنیا پر حکمرانی کرے۔

اب اس دنیا میں صرف وہی نیم جوان اور نیم بوڑھے ایسے تھے جن میں باپ بننے کی صلاحیتیں تھیں اور جو وہاں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ تین بڑوں کے حکم سے قتل کر دیا گیا اور اُن کی لاشیں چھپا دی گئیں۔ اس کے بعد شے می کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ کہیں بھی جا کر اس دنیا کو آباد کرنے کیلئے اپنی قسمت آزما سکتی تھی۔

اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا جیون ساتھی بن سکتا۔ وہاں صرف ایسے لوگ تھے جو بڑھاپے کی آخری منزل پر اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ مایوس ہو کر رونے لگی وہ تابوت میں دفن ہو گئی تھی، اچھا ہی تھا وہاں سکون سے تھی اب اسے قبر سے نکال کر اور اس کے جذبات بھڑکا کر اسے رونے کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ جگہ جگہ جاتی تھی، کبھی فریاد کرتی تھی اور کبھی ان پر لعنت و ملامت کرتی تھی۔

"یہ کیسی دنیا ہے؟ کیا یہ انہی انسانوں کی دنیا ہے جنہیں اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے ذرا آئینہ اٹھا کر دیکھو، تمہارے مردہ چہروں پہ کیسے پھٹکار برس رہی ہے۔"

تم سمجھتے تھے کہ بچوں اور جوانوں کے بغیر تمہاری دنیا آباد رہے گی کیسے رہے گی؟ جوانی ایک قوت کا نام ہے جو پھول کھلاتی ہے فصل اگاتی ہے اور عورت کو ماں بناتی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا؟ تم سب احمق ہو۔ تم نے اپنی تقدیر کو خدا کے بجائے اس دنیا کے چار بڑے شیطانوں کے حوالے کر دیا وہ بڑی طاقتیں تمہاری تقدیر کی مالک بن گئیں۔ وہ تمہیں اخلاقی موت مارتے تھے اور زندہ رکھنے کے لیے گندم کی خیرات دیتے تھے۔ انہوں نے آبادی کم کرنے کے لیے تمہاری ماؤں اور بہنوں کی کوکھ اجاڑ دی اور اب آخری وقت تم اپنی اور اس دنیا کی تباہی کا تماشہ دیکھ رہے ہو۔

وہ جہاں جاتی تھی، فریاد کرتی تھی اور روتی تھی۔ روتے روتے وقت گزرنے لگا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بوڑھیاں اور بوڑھے مرنے لگے۔ ان تین بڑی طاقتوں نے بھی دم توڑ دیا اور وہ اس دنیا میں

تنہا رہ گئی۔

بستیاں ویران ہو گئیں۔ راستوں میں دھول اڑنے لگی۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی اور بوجھل سناٹا چھایا ہوا تھا وہ ویران بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بھٹکنے لگی۔

جنگلوں میں چہچہاتے ہوئے پرندے اور غراتے ہوئے درندے تھے وہ دنیا اب جانوروں سے آباد تھی، اور وہاں ہر پرندے اور ہر جانور کا جوڑا تھا صرف شے می تنہا تھی۔ اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا وہ قیامت کے انتظار میں تنہا بھٹک رہی تھی اور قیامت کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

وہ گھنے جنگلوں سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس بلندی سے دھرتی کی نظر آ رہی تھی۔ لباس کے بغیر یہ دنیا ننگی ہو جاتی ہے اس لئے دنیا ننگی نظر آ رہی تھی۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر صبح سے شام ہونے لگی۔ تب اچانک ہی اسے عجیب سی آواز سنائی دی وہ ہنسی کی آواز تھی۔ آدھی انسانی ہنسی تھی آدھی حیوانی ہنسی تھی۔ "ہی ہی ہی۔ کھی کھی کھی۔۔۔۔"

سامنے ایک درخت کی شاخیں ہل رہی تھیں اور پتیاں شور مچا رہی تھیں پھر اس گھنے درخت سے ایک بندر چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آیا اور ایک قلابازی کھا کر کھڑا ہو گیا۔

شے می نے حیرانی سے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا وہ ایسا بندر تھا جو ڈارون کی تھیوری کے مطابق ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسانی سراپے میں ڈھل گیا تھا اس کے جسم کے بال وقت کے ساتھ ساتھ سوکھے پتوں کی طرح بکھر گئے تھے اس کے ہاتھ پاؤں کسی قدر سیدھے ہو گئے تھے اور چار پاؤں کے بجائے دو پاؤں سے چلنے لگا تھا۔

وہ دو پاؤں سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور سر جھکا کر کہا۔ "آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا؟ لیکن میں نے پہچان لیا ہے آپ میری مالکہ ہیں ہم ہزاروں سال سے بچھڑے ہوئے ہیں اور آج پہاڑ کی اس چوٹی پر آ ملے ہیں۔"

شے می کو یاد آ گیا کہ اس کے خاوند عظیم صدیقی کے دادا نے اس بندر کو آب حیات پلایا

تھا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے۔ میں تنہائی سے گھبرا رہی تھی۔ اب مجھ سے باتیں کرنے والا ایک ساتھی مل گیا ہے۔"

"ہاں ہم باتیں کریں گے، دیکھو یہ دنیا کیسی اُجڑ گئی ہے۔"

"ہاں اب زمین پر میں اکیلی رہ گئی ہوں۔"

بندر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اب اس دھرتی پر ہم دو ہی جاندار رہ گئے ہیں۔ یہ دنیا بچوں کی ہنسی کے بغیر کتنی اُداس ہے۔ آؤ ہم ایک نئی دنیا کی تیاری کریں۔"

یہ کہتے ہی اس نے شے می کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ وہ ایک دم سے کانپ گئی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا۔

"آہ! کیا ڈراون کی تھیوری کے مطابق اب یہ آدمیوں کا باپ بنے گا؟"

اس خیال کے آتے ہی وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

ایسے مسیحاؤں کی کہانی
جو شیشوں کے نازک بدن
کو توڑتے ہیں۔ پھر ہار
پچھتا کر انہیں پیار سے
جوڑنے پر مجبور ہو
جاتے ہیں۔

آدھی رات اِدھر تھی اور آدھی اُدھر اور وہ اُدھر ہی آ رہا تھا۔ صوفیہ کی آنکھ کھلی تو وہ تکیے سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک آیا تھا اور جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفیہ نے پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کر آہستہ آہستہ لنگڑاتی ہوئی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کے کی ہول میں چابی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نشے کے باعث اس کا ہاتھ بہک بہک جاتا تھا۔

"آدمی کتنی آسانی سے قبر میں اُتر جاتا ہے۔ مگر ایک چابی اپنے سوراخ میں نہیں اترتی۔ جب تک سانس چلتی رہتی ہے، زندگی کی چابی اسی طرح اِدھر سے اُدھر بہکتی رہتی ہے نہ تالا کھلتا ہے، نہ سوچی ہوئی جنت کا دروازہ کھلتا ہے۔"

وہ نشے میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"خالد! تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ آدھی رات کو آ کر بڑبڑایا نہ کرو، امی اُٹھ جائیں گی۔ لاؤ ــــ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

وہ اس کے ہاتھ سے چابی لے کر دروازہ کھولنے لگی۔ خالد نے دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔

"دروازہ کھولنا۔ بتی نہ جلانا۔ یہ اندھیرا ہماری بہت سی کمزوریوں کو چھپا لیتا ہے۔"

"اپنی کمزوریوں کی طرف سے آنکھ بند کر لینا اچھی بات نہیں ہے تم اس گھر کو کباڑ خانہ کہتے ہو۔ ٹھیک ہے دوسرے کمروں میں ڈھنگ کا سامان نہیں ہے، دیواروں کے پلاسٹر اکھڑے ہوئے ہیں۔ تم اب اپنے کمرے میں جا کر ٹوٹی ہوئی چارپائی پر سو جاؤ گے۔ تم اندھیرے میں اس کمرے کو قبول کر لیتے ہو مگر روشنی میں اس ٹوٹی ہوئی چارپائی کو دیکھنا نہیں چاہتے ــــ تم یہاں ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں سو جاتے؟"

ڈرائنگ روم کا بلب اُونگھ رہا تھا۔ وہ بلب اُن کی زندگی کے کم پاور کی طرح اونگھتا رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز کو ٹوٹی ٹوٹی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ خالد نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"ہاں! یہ ڈرائنگ روم کچھ سلیقے کا ہے۔ ایک صوفہ دس برس پرانا ہے دوسرے کی

عمر سات برس ہے تیسرے صوفے کی عمر کا اندازہ کرنے کیلئے اسکی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ لینا کافی ہے ان کے درمیان جو سنٹر ٹیبل ہے اس کی سطح پر جا بجا خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ میری تنخواہ سے اتنے پیسے نہیں بچتے کہ ان پر رنگ و روغن چڑھایا جا سکے ڈائننگ ٹیبل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس کا عیب چھپانے کیلئے اس پر پلاسٹک کی چادر بچھا دی گئی ہے۔ شیشے کا شوکیس شیشے کے برتنوں سے خالی ہے وہاں تم نے شیشے کی ایک گڑیا کو بہت دنوں سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے تمہارے دل میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یہ کہیں ٹوٹ نہ جائے اس ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ایسے لگتی ہے جیسے کوئی بوڑھی عورت اپنی ظاہری خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لئے پرانے زمانے کے مسی کاجل یا سُرمے سے کام چلا رہی ہو کیونکہ نئے زمانے کے نئے میک اپ کے لوازمات بہت مہنگے ہیں اس بوڑھے ڈرائنگ روم تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"خالد! تم ہمیشہ دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو ــــ دل ہو یا کانچ کی گڑیا ہو انہیں توڑنے کی بجائے سنبھال کر رکھنے کا نام ہی زندگی ہے۔"

ایسا کہتے وقت وہ بڑی اُداس نظروں سے شوکیس میں رکھی ہوئی کانچ کی گڑیا کو دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں شبنم سی جھلنے لگی۔ خالد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"باجی! تم کب تک اس گڑیا سے کھیلتی رہو گی؟"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ اس آواز سے بوسیدہ دیواریں گونج اُٹھیں۔

"تم آج بھی اتنی رات کو آئے ہو اور نشے کی حالت میں صوفیہ کو پھر باجی کہہ رہے ہو اگر کسی نے سن لیا تو؟"

بوڑھی ماں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی ــــ وہ ڈرائنگ روم ایک قسم کا چوراہا تھا وہاں سے دوسرے کمروں کے دروازے کھلتے تھے ایک دروازہ خالد کے کمرے میں کھلتا تھا دوسرا دروازہ ان کی ماں کے کمرے میں لے جاتا تھا تیسرے دروازے کے پیچھے باورچی خانہ

تھا اور چوتھا دروازہ باہر سے آنے والوں کے لئے تھا۔ صوفیہ کے لئے کوئی کمرہ نہیں تھا۔ اس کا سامان ماں کے کمرے میں رہتا تھا اور وہ رات کے وقت ڈرائنگ روم کے فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی ان ماں، بیٹے اور بیٹی کی سب سے پہلی اور اہم دعا یہی ہوتی تھی کہ کوئی مہمان ان کے یہاں نہ آئے۔ ورنہ اوپر سے جو خوش پوشی کا بھرم قائم رہتا ہے، وہ ٹوٹ جائے گا۔ ماں نے قریب آکر پوچھا۔

"بتاؤ تم نے صوفیہ کو باجی کیوں کہا؟"

"امی! باجی مجھ سے بڑی ہیں اس لئے میں انہیں باجی کہتا ہوں۔"

ماں نے جھنجلا کر کہا۔ "ہزار بار منع کیا ہے کہ شراب نہ پیا کرو۔ نشے میں سچ بولنا شروع کر دیتے ہو۔"

"امی جھوٹ بول کر دیکھ لیا اب تک کہیں سے باجی کا رشتہ نہیں آیا۔"

"تم پھر باجی کہہ رہے ہو۔ اتنے لمبے چوڑے جوان ہو لوگ تمہیں دیکھ کر تمہاری بہن کا اندازہ لگالیں گے اگر تم اسے صوفیہ کہہ کر پکارا کروگے تو تمہارے ایک نام لے لینے سے اس کی عمر تم سے پانچ برس، دس برس کم ہو جائے گی بھاگتے ہوئے رشتوں کو پکڑنے کیلئے بھاگتی ہوئی عمر کو پکڑ کر جھوٹ کے شوکیس میں بند کرنا ضروری ہے بیٹے۔"

خالد کے دماغ میں نشہ گھوم رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی اس چکراتے ہوئے منظر میں اس نے دیکھا اس کی بہن ایک ذرا سی ڈگمگاتی ہوئی شوکیس کی طرف جارہی ہے اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے وہ نشے میں نہیں تھی ڈگمگانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ایک پاؤں میں معمولی سا پیدائشی نقص تھا۔ چلتے وقت وہ دائیں طرف ایک ذرا سی یوں جھک جاتی تھی جیسے تقدیر لات مار کر ایک طرف گراتی جارہی ہو اور وہ سنبھلتی جارہی ہو۔ چال میں اتنی معمولی سی لنگڑاہٹ ہوتی تھی جو پہلی نظر میں محسوس نہیں ہوتی تھی اگر وہ تیزی سے چلتی تو یہ عیب بھی چھپ جاتا لیکن قدرت نے تو عورت کو سبک لہروں کی طرح بہنے کے لئے پیدا کیا ہے وہ

سیلاب کی طرح نہیں گذر سکتی تھی۔ جوان لڑکی کی ایک جاذبیت یہ بھی ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔

وہ شوکیس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اس نے شیشے کی دیوار کو ہٹا کر بڑی محبت سے اور بہت سنبھل کر کانچ کی گڑیا اٹھائی۔ وہ جتنی عمر کی گڑیا بنائی گئی تھی اس کی وہی عمر اس کے کانچ کے وجود میں ٹھہر گئی تھی اس وقت بوڑھی ماں نے بڑی حسرت سے سوچا۔ کاش کہ صوفیہ کی عمر بھی ٹھہر جاتی۔ وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ اسے سہارا دے کر چارپائی پر سلایا۔ پھر اس کے قریب بیٹھنا چاہا تو ٹوٹی ہوئی چارپائی احتجاج کرنے لگی۔ وہ مجبوراً فرش پر بیٹھ کر کہنے لگی۔

"تم روز آدھی رات کے بعد آتے ہو فضول سے نشے میں پیسے برباد کرتے ہو یہی پیسے بچا کر ہم صوفیہ کو دلہن بنا سکتے ہیں۔"

"کس کی دلہن؟"

بیٹے کا سوال ماں کے دل میں نشتر بن کر چبھ گیا۔ دولہا کا دور دور تک پتہ نہیں تھا اور وہ خیالوں میں بیٹی کو دلہن بنا کر بٹھائے رکھتی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو وہ دلہن بنے گی ہی ـــــ اسی امید پر اس نے کہا۔

"کسی دولہا کو بلانے سے پہلے دلہن کو بنا سنوار کر رکھنا پڑتا ہے جس گھر میں وہ رہتی ہے اسے بھی تھوڑا بہت سجا بنا کر رکھنا ضروری ہے میں چاہتی ہوں قسطوں پر نئے صوفے خرید لیں۔ تھوڑے پیسے بچا کر دروازے کھڑکیوں کے لئے نئے پردے لے آئیں۔ یہاں تھوڑی بہت نمائش کے بغیر کام نہیں بنتا۔ مگر تم اس فضول نشے میں پیسے برباد کرتے ہو۔"

خالد نے کروٹ بدل کر کہا۔

"امی! سستے سے سستا صوفہ ایک ہزار روپے میں آئے گا سستے پردوں اور کمرے کے رنگ و روغن میں مزید ایک ہزار روپے خرچ ہوں گے اور میں جو سستی سی شراب پیتا ہوں اس کا پوا چھ روپے میں آتا ہے میں چھ روپے خرچ کر کے اس غم کو بھول جاتا ہوں کہ ہمیں دو ہزار روپے کہیں سے

نہیں ملیں گے۔ یہ نشہ لعنت نہیں ہے بہت بڑی نعمت ہے ہم صبح تک تمام محرومیوں کو بھول جاتے ہیں اور میں کونسا روز روز پیتا ہوں۔ مگر کبھی کبھی تو مجھے جینے کے لئے شراب پی کر مرنے کی اجازت دیا کریں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ اس گھر میں میری بہو آجائے گی تو تم بہت سے غم بھول جایا کرو گے۔"

"ہاں۔ اگر کبھی آپ کی بہو آئے گی تو کچھ پرانے غم بھول جائیں گے مگر بہت سی نئی پریشانیاں اور بہت سی نئی نئی ضرورتیں آپ کی بہو ساتھ لے آئے گی۔ امی! میں تو شادی کے بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں۔ جب ایک بیوی کے لئے دل مچلتا ہے تو میں کوئی نئی فلم دیکھ لیتا ہوں۔ جب ہم غریبوں کو عورت نہیں ملتی تو فلم کی نئی نئی ہیروئنیں مل جاتی ہیں۔ سینما ہال کے اندھیرے میں وہ صرف ہمارے لئے گیت گاتی ہے ہمارے لئے آہیں بھرتی ہے دولتمند باپ کی بیٹی ہو کر ایک غریب سے شادی کرنے کے لئے رسم و رواج اور جھوٹی شان و شوکت سے بغاوت کرتی ہے آخر میں مجھ جیسے غریب سے شادی کر لیتی ہے میں سینما ہال کے اندھیرے سے نکل کر اندھیری گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے اس اندھیرے کمرے میں آجاتا ہوں میرے ساتھ سینما ہال سے نکلی ہوئی دلہن بھی ہوتی ہے۔ وہ ابھی یہاں موجود ہے اس کمرے کی بتی جلے گی تو وہ چلی جائے گی جب بیٹے کے کمرے میں بہو موجود ہو تو ماں کو وہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ آپ چلی جائیں امی ـــ کیوں میرا نشہ خراب کر رہی ہیں۔"

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر ماں اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور خود بھی بڑبڑاتی ہوئی اس کمرے سے باہر آگئی۔ وہ کس کی ضرورت پوری کر سکتی تھی؟ بیٹا ایک بیوی کے بغیر ویران اور خالی خالی سی زندگی گزار رہا تھا اور بیٹی سہاگن بننے کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھی اس نے بیٹے کے کمرے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ایک دولتمند بہو اس کے بیٹے کے کمرے میں آگئی ہو اور اس کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اس کے ساتھ ......

آگے سوچتے ہی اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ یہ آج کل کے لڑکوں کو دروازہ بند کرنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ صبح چائے کے لئے ایک پاؤ دودھ رکھا ہوا تھا اب بہو کے لئے وہ دودھ کرے

میں بھیجا ہوگا۔ اس نے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی صوفیہ کو دیکھا تو بیٹے والا سہانا خواب ٹوٹ گیا کیونکہ بیٹی ابھی تک اپنی گڑیا کی عمر کو ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی اس نے بیٹی کے پاس آکر کہا۔

"کب تک بیٹھی رہے گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے سہیلیاں بنانا چاہئیں۔ دوسروں کے یہاں آتی جاتی رہے گی تو رشتہ ڈھونڈنے والوں کی نظر میں بھی آتی رہے گی۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "امی مجھے شرم آتی ہے میں باہر نکلتی ہوں تو یہ سوچ کر دل بیٹھنے لگتا ہے کہ سب لوگ مجھے لنگڑاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔"

"تم کیوں احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہو۔ تم لنگڑی نہیں ہو۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے کوئی بظاہر جسمانی طور پر مکمل ہوتا ہے تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی چھپی رہتی ہے چھپی ہوئی خرابی ظاہری عیب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دیکھو! خود کو تسلی دینے اور سمجھانے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ اگر تم خود کو گراؤ گی تو دوسرے اور گرائیں گے۔ تم خود کو یہ سمجھاؤ کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو تم سے زیادہ لنگڑی ہیں یا دوسرے جسمانی عیب رکھتی ہیں مگر کسی نہ کسی طرح ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ تم ان سے ہزار درجہ بہتر ہو اب میں نے سوچ لیا ہے کہ کہیں سے قرضے لے کر قسطوں میں سامان اٹھا کر ایک ڈرائنگ روم کو سجاؤں گی کراچی جیسے شہر میں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے ہم انسانوں کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ تم سو جاؤ فکر نہ کرو۔ فکر کرنے کیلئے ابھی میں زندہ ہوں۔"

ماں نے اس کے ہاتھ سے کانچ کی گڑیا لے لی پھر اسے شوکیس میں رکھتی ہوئی بڑبڑانے لگی۔

"ہر بڑے آدمی کے گھر کا دروازہ اس کے ڈرائنگ روم سے کھلتا ہے آنے والوں کو صرف ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا ہے اپنی اونچی حیثیت کی نمائش کرنے کے لئے اس کمرے کو خوب سے خوب سجایا جاتا ہے کسی ناول کا دیباچہ خوبصورت نہ ہو تو اس کے بعد شروع ہونے والی کہانی کی ہیروئن کی خوبصورتی اور معیار کا پتہ نہیں چلتا۔ ڈرائنگ روم کو ناول کے پیش لفظ

کی طرح سجانا پڑتا ہے۔ اب میں یہی کروں گی۔"

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھنے کے بعد بیٹی کی طرف دیکھا وہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ لیٹنے بیٹھنے اور کھڑے ہونے سے ذرا بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ تھوڑی سی لنگڑی ہے لیٹنے کے بعد تو قیامت نظر آتی تھی۔ پکا ہوا بدن لباس میں چھپ کر بھی ہر طرف سے منہ زوری کرتا تھا ماں سوچتی ہی رہ جاتی تھی کہ اسے کس شوکیس میں بند کر کے رکھے۔ کھلا چھوڑے گی تو یہ کانچ کی گڑیا کسی کے ہاتھوں سے ٹوٹ جائے گی۔

وہ پھر بڑبڑاتی ہوئی اور اپنی قسمت کو کوستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی وہ چپ چاپ چٹائی پر لیٹی ہوئی دیوار گھڑی کی ٹک ٹک سن رہی تھی۔ دیوار گھڑی زمانے کی ستائی ہوئی تھی اتنی بوڑھی ہو گئی تھی کہ اس کے ڈائل کے تمام نمبر تقریباً مٹ گئے تھے صرف پنڈولیم کے ذریعے اس کی سانس چلتی تھی اور دونوں کانٹے ڈائل کے سپاٹ صحرا میں اپنی زندگی کی مدت پوری کرنے کیلئے گھومتے رہتے تھے وہ کانٹے خود نہیں جانتے تھے کہ کس وقت کیا بجا رہے ہیں مگر اس گھر کے رہنے والے دونوں کانٹوں کی پوزیشن دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ وقت کیا ہوا ہے۔ وہ کانٹے کیسے اندھے سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے؟

صوفیہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کاش کہ میری عمر کے تمام نمبر بھی میری زندگی کے ڈائل سے مٹ جاتے پھر امی کے سوا کوئی یہ نہ بتا سکتا کہ اس وقت میری عمر کیا بجا رہی ہے انسان مایوس ہو کر کیسی کیسی احمقانہ باتیں سوچتا رہتا ہے۔ ایسا سوچنے سے کچھ حاصل تو نہیں ہوتا مگر اس طرح زندگی کا کچھ حصّہ دھوکے سے گذر جاتا ہے۔

خالد کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ اس نے دروازے سے سر نکال کر سب سے پہلے اپنی ماں کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی امی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہی تھیں وہ اطمینان سے ڈرائنگ روم میں آ گیا اور دور سونے والی صوفیہ کو خمار آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے کمرے کے اندھیرے سے نکل آیا تھا۔ سینما ہال کے اندھیرے سے آئی ہوئی

دلہن اس کے کمرے کے اندھیرے سے گھبرا کر بھاگ گئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا خود کو ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا صوفیہ کے پاس آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ صوفیہ کا ایک ہاتھ چٹائی کے بستر سے باہر فرش پر آ گیا تھا۔ اس کی ہتھیلی یوں کھلی ہوئی تھی جیسے بھائی سے وہ کچھ مانگ رہی ہو بھائی اس کے قریب بیٹھ کر ذرا ہچکچانے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر بہن کے ہاتھ پر رکھا تو اس وقت بری طرح کانپ رہا تھا۔ ہاتھ سے ہاتھ ملا تو صوفیہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے حیرانی سے بھائی کو دیکھا پھر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"خالد! کیا بات ہے؟ تم اس وقت میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"وہ بات ۔۔ یہ ہے کہ۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے جھجک رہا تھا۔

"تم پریشان کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں ایسی کیا بات ہے کہ میرے سامنے جھجک رہے ہو مجھے بتاؤ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکتی ہوں تو انکار نہیں کروں گی۔"

"باجی! بات دراصل یہ ہے کہ میں دن بھر مشین کے سامنے کھڑے ہو کر کام کرتا رہتا ہوں مگر میں انسان ہوں مشین تو نہیں ہوں میری بہت سی خواہشیں ہیں۔ بہت سی ضرورتیں ہیں جو میری چھوٹی سی تنخواہ میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ حالات بتا رہے ہیں کہ میں تمہارے لئے کبھی ایک بھابی نہیں لا سکوں گا مگر دیکھو نا کسی سے دوستی کرنے سے میری زندگی کی ایک کمی کسی حد تک پوری ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکی سے میری دوستی ہو گئی ہے۔"

"اچھا" صوفیہ نے خوش ہو کر پوچھا "کون ہے وہ لڑکی؟ کہاں رہتی ہے وہ؟ میں لے اپنی بھابی بناؤں گی۔"

"تم پھر جھوٹے خواب دیکھنے لگیں۔ یہاں کوئی لڑکی آ سکتی ہے تمہاری بھابی نہیں آ سکتی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ مجھے ساڑھے تین سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اس میں ہم تینوں کا گزارہ نہیں ہوتا۔ چوتھی آ گئی تو ہم سب فاقے کریں گے یہ بڑھتی ہوئی مہنگائی میری ہونے والی بیوی کو مجھ سے بہت دور لے گئی ہے۔ تم مجھے تقریر کرنے پر مجبور نہ کرو۔ کام کی بات سنو۔ اس کا نام زبیدہ ہے۔ وہ اکی ایک

فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتی ہے اس کی فیکٹری میری مل کے راستے میں ہے روزانہ آتے جاتے ہماری جان پہچان ہوگئی ہے اب میں اسے دو چار گھنٹے کے لئے یہاں لانا چاہتا ہوں ——— میرا مطلب ہے صرف باتیں کرنے کیلئے ——— تم سمجھ سکتی ہو کہ راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا "

" تو پھر اسے یہاں لے آؤ۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ؟"

" میں چاہتا ہوں کہ امّی کو یہ معلوم نہ ہو۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ اسے بہو بنانے کیلئے تیار ہو جائیں گی۔ اور اس گھر میں جو خسارے کا بجٹ ہے اس میں ایک بہو کیلئے گنجائش نہیں نکلے گی۔ دیکھو میں صرف تمہیں رازدار بنانا چاہتا ہوں، امّی کو بیچ میں نہ لاؤ "

" اچھا نہیں نہیں لاؤں گی۔ تم اسے کب لا رہے ہو ؟"

" کل لے آؤں گا۔ امّی صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے چلی جاتی ہیں۔ وہ دوپہر کو تین بجے واپس آتی ہیں۔ میں زبیدہ کو گیارہ بجے لے کر آؤں گا۔ تم گھر میں رہتی ہو اس لئے میں تمہیں رازدار بنا رہا ہوں امّی کو نہیں بتاؤ گی نا ؟"

" نہیں بتاؤں گی۔ اپنے بھائی کی خوشیوں کو اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی "

خالد نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ مگر صوفیہ کی آنکھوں کے دروازے کھل گئے تھے نیند اچانک ہی اڑ گئی تھی وہ سونا چاہتی تھی مگر اس کا دماغ اس کے دل کو ٹہوکے دے دے کر پوچھ رہا تھا۔

" زبیدہ یہاں کیوں آئے گی ؟ ایک جوان لڑکی اس کے بھائی کے ساتھ کیوں آئے گی ——— یہاں کیا ہوگا ؟

وہ سوالیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی اسے یہ گھر بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس میں وہ بات ہونے والی تھی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی مگر وہ بات کیا تھی ؟ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے انکار کرتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہی تھی اس کوشش میں صبح ہونے لگی اذان کے بعد ذرا آنکھ لگی تو اس نے خواب میں کسی اجنبی نوجوان کو دیکھا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

" راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ ہمیں دیکھتے رہتے ہیں تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، وہاں ہم تنہائی میں اطمینان سے پیار و محبت کی باتیں کریں گے "

وہ خواب کے شہزادے سے کہنے لگی۔

" مجھے ڈر لگتا ہے میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر کیسے جا سکتی ہوں۔ کسی نے دیکھ لیا تو میں بدنام ہو جاؤں گی "

" کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ہم محبت کر رہے ہیں کوئی جرم تو نہیں کر رہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تنہائی میں صرف باتیں کریں گے "

صرف باتیں ہی کرنے کی بات تھی وہ اپنے آئیڈیل کے ساتھ اس کے گھر میں آ گئی پھر اس کے کمرے میں پہنچ گئی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے محبوب نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا اکثر خواب کلائمکس پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ یا پھر جو بات سمجھ میں نہیں آتی اس بات تک پہنچنے سے پہلے وہ خواب بکھر جاتے ہیں جیسے ہی اس نوجوان نے دروازہ بند کیا ویسے ہی اس کی امّی کی آواز نے چونکا دیا۔

" کیا بات ہے۔ اتنی دیر تک کیوں سو رہی ہو ؟ اب اٹھ بھی جاؤ "

اس نے چونک کر آنکھ کھولی تو خواب کے ساتھ ساتھ دل بھی ٹوٹ گیا۔ کیسی نامراد زندگی ہے، نہ جاگتی آنکھوں کے سامنے کوئی دولہا دروازہ بند کرتا ہے، نہ سوتی آنکھ کے پیچھے وہ آرزو شرمندۂ تکمیل ہوتی ہے وہ بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل پر خالد جھکا ہوا ناشتے میں مشغول تھا امّی اس کے پاس بیٹھی ہوئی سمجھا رہی تھیں۔

" کام پر جانے کی جلدی ہوتی ہے تو ذرا سویرے اٹھ جایا کرو۔ جلدی جلدی نوالے چبا کر کھاؤ گے تو ہاضمہ خراب ہو جائے گا۔ تم جانور تو نہیں ہو کہ بعد میں جگالی کر کے ہضم کرو گے "

" امی ! ہم مزدور بیل کی طرح جگالی نہیں کرتے۔ مگر کولہو کے بیل کی طرح محنت کے ایک ہی محور پر ساری زندگی گھومتے رہتے ہیں آپ چائے پیتی جائیں ٹھنڈی ہو رہی ہے "

اس کی امی چائے کی پیالی پر جھکی تو وہ صوفیہ کو دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہنے لگا۔ پچھلی رات بہن سے رازداری کی بات ہو چکی تھی لہٰذا نظروں نے نظروں کو پہچان لیا۔

"دیکھو اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ امی کو کچھ نہ بتانا۔ میں گیارہ بجے زبیدہ کے ساتھ آ جاؤں گا۔"

جتنی دیر میں اس کی امی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا، اتنی دیر میں خالد نے نظروں سے سب کچھ سمجھا دیا پھر وہ اضطراب کے عالم میں ادھورا ناشتہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے حیرانی سے کہا۔

"ارے کہاں چلے۔ ناشتہ تو ٹھکانے سے کر لیا کرو۔"

"بس پیٹ بھر چکا ہے۔"

"تو پھر چائے پی لو۔"

"امی! آپ تو پیچھے پڑ جاتی ہیں چائے ڈیوٹی سے بڑھ کر نہیں ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ کرسی کی پشت سے کوٹ اٹھا کر پہننے لگا۔ وہ کوٹ اس کے لئے پچھلے ہی ہفتے امریکہ سے آیا تھا۔ امریکہ والے بڑے غریب پرور ہوتے ہیں ہمارے ملک کے غریبوں کیلئے ٹنوں کے حساب سے جدید فیشن کے کوٹ پتلون بھیجتے رہتے ہیں سردی کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ مگر پیار کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ زبیدہ کے ساتھ ذرا جچنے کے لئے اس نے کوٹ پہن لیا تھا۔ اپنی شخصیت کو ذرا پرکشش بنانے کیلئے اس کے پاس اس کوٹ سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔

جب وہ چلا گیا تو صوفیہ کے لئے گیارہ بجے تک وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ دس بجے تک اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب دس بجے اس کی ماں پرائمری اسکول میں بچوں کو پڑھانے چلی گئی تو باقی ایک گھنٹہ پہاڑ بن گیا۔ کچھ خالد کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا کچھ اس کا اپنا خواب اسے پریشان کر رہا تھا۔

"توبہ توبہ۔ کیسا شرمناک خواب تھا۔ آج تک اس نے کسی اجنبی نوجوان سے بات نہ کی تھی اور خواب ہی خواب میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی توبہ توبہ میں کبھی ایسا نہیں کروں گی۔"

وہ اس نفسیاتی الجھن کو نہ سمجھ سکی کہ لڑکی جس بات سے انکار کرتی ہے لاشعوری طور پر خواب کے عالم میں اسی بات کا اقرار کرتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد شرمیلی تھی اور اس قدر احساس کمتری میں مبتلا تھی کہ کبھی کسی اجنبی کے قریب سے گزرتے وقت بھی خود کو بالکل ہی حقیر سمجھ کر سکڑ سی جاتی تھی۔

گیارہ بجے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک سنتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کے ساتھ دوسرے گھر کا دروازہ کھول کر اندر جانے والی ہو۔ اس نے دروازہ کھولا تو خود کو ایکدم سے اجنبی ماحول میں پایا۔ ایک اجنبی نوجوان دروازے پر کھڑا ہوا تھا وہ جلدی سے دروازے کی آڑ لے کر اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے سوتی آنکھ کے دروازے سے نکل کر جاگتی آنکھوں کے سامنے کیسے آ گیا ہے؟

صوفیہ نے دروازہ کھولتے وقت اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا کیونکہ وہ فوراً ہی دروازے کے پیچھے چلی گئی تھی وہ بھی چند لمحوں تک گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"خالد کہاں ہے؟ میں اس کا دوست ہوں۔"

صوفیہ کے دماغ میں اس کی بات کا جواب موجود تھا مگر اس وقت وہ بولنا بھول گئی تھی۔ اجنبی نے ذرا انتظار کے بعد پوچھا۔

"کیا تم گونگی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی خوبصورت لڑکی قوتِ گویائی سے محروم ہو سکتی ہے۔"

اس کی بات سن کر وہ گھبرا گئی۔ ایک تو پہلے ہی قدرت نے اس میں عیب لگا دیا تھا اب کسی نے اسے گونگی سمجھ لیا تو کیا ہو گا؟ وہ کوئی تاثر حاصل کئے بغیر وہاں سے چلا جائے گا۔ وہ بڑی مشکل سے ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"وہ ــــ وہ نہیں ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم بولنے والی گڑیا ہو۔ میں تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ تم برا نہ ماننا۔ ہر اچھی چیز تعریف کی مستحق ہوتی ہے تم ایک گڑیا کی طرح حسین بھی ہو اور معصوم بھی۔"

صوفیہ کے کانوں میں شہنائی بج رہی تھی ۔ اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں کوئی ہوس کے پٹارے میں بند کرنے کیلئے بین بجاتا ہے کوئی اسے شہنائی کی آواز سمجھ لیتی ہے ۔ یہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہوتی ہے اجنبی کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔

"خالد نے شادی نہیں کی ہے تم اس کی گھر والی تو نہیں ہو سکتیں ۔ پھر کون ہو؟"

"میں ــــ میں ان کی بہن ہوں ۔ بس آپ ــــ چلے جائیں میں دروازہ بند کروں گی ۔"

"چلا جاؤں گا ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں خالد کے ساتھ مل میں کام کرتا ہوں ۔ آج وہ ڈیوٹی پر نہیں آیا ہے ۔ میں آدھے گھنٹے کی چھٹی لے کر اس کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں ــــ اور تم ہو کہ دروازہ بند کر رہی ہو ۔"

وہ جواب کا انتظار کرنے لگا جواب نہیں ملا ۔ دروازہ بھی بند نہیں ہوا کسی لڑکی کی اتنی سی خاموشی بہت کچھ سمجھا دیتی ہے اس نے پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا ۔

"تم بہت اچھی ہو ۔ میں پہلے بھی اس گھر کے سامنے آ چکا ہوں ۔ میری خالد سے باہر ہی ملاقات ہو جایا کرتی تھی آج پہلی بار دستک دینے کا اتفاق ہوا ۔ کتنا حسین اتفاق ہے ۔ میری ایک بات مان لو ۔ بس ایک بار اپنا چہرہ دکھا دو ۔ میں تمہاری صورت اپنے دل میں اتار کر چلا جاؤں گا ۔"

ہائے کیسے دل میں اتر جانے والے بول تھے ــــ اجنبی نوجوانوں کے بازار سے اس دروازے پر پہلی بولی آئی تھی جو اس گمنام سی لڑکی کا بھاؤ بتا رہی تھی ۔ اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے کے بعد بھی اس میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ خود کو دکھانے کیلئے بے حیائی سے سامنے چلی جاتی ۔ وہ دروازے کے پیچھے سہمے سہمے لرزتی رہی اجنبی نے مایوس ہو کر کہا ۔

"میں سمجھ گیا تم سامنے نہیں آؤ گی ۔ میں جا رہا ہوں ۔ اگر میرا نام یاد رکھ سکو تو یاد کر لینا ۔ میرا نام احسن ہے ــــ خدا حافظ ۔"

اس کے بعد اس کی آواز گم ہو گئی شاید وہ چلا گیا تھا وہ بڑی پریشانی سے سوچنے لگی کہ وہ سامنے کیوں نہیں گئی ۔ آج کل کی لڑکیاں تو مرد سے ایک ہاتھ آگے نکل جاتی ہیں وہ پیچھے کیوں

رہ گئی ۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے دروازے کو بند کر دیا اس کے بعد بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی شوکیس کے پاس آ گئی ۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے کانچ کی گڑیا کھڑی ہوئی تھی اس گڑیا کے سامنے بھی کوئی اجنبی آیا ہو گا مگر اس بے جان گڑیا نے شیشے کی دیوار نہیں ہٹائی ہو گی اس کی طرح دروازے کے پیچھے سے نکل کر اپنا مکھڑا نہیں دکھایا ہو گا ۔

اس نے شیشے کو ایک طرف سرکا کر گڑیا کو بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی ۔ اب اس کا بھائی آیا ہو گا اور اس کے ساتھ زبیدہ بھی ہو گی اس کے دل سے ایک آہ نکلی ۔ آہ زندگی کے راستوں میں ہر ایک کو ایک نہ ایک ہمسفر مل جاتا ہے ۔ زبیدہ کو بھی مل گیا ۔ اور وہ اپنی لنگڑی چال کو چھپائے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی ۔

اس ڈرائنگ روم کے باہر جب تک وہ قدم نہ نکالتی کوئی اسے سمجھنے والا ہمسفر نہیں ملتا ماں نے اسے کئی بار سمجھایا تھا مگر وہ اپنے دماغ سے احساسِ کمتری کو نہیں مٹا سکی تھی اس لئے وہ کبھی کبھی بہت مجبور ہو کر باہر نکلتی تھی کسی اجنبی کو دوست بنانا تو دور کی بات ہے وہ کسی لڑکی کو سہیلی بناتے ہوئے بھی ہچکچاتی تھی ۔ اسی لئے باہر جا کر خالی ہاتھ واپس آ جاتی تھی ۔ یہ تو پتہ نہیں کیسے اتنی مدت کے بعد ایک اجنبی راستہ بھول کر آ گیا تھا لیکن اس نے شرم و حیا کے باعث یا ماڈرن خیال کے مطابق اپنی حماقت سے دروازہ بند کر دیا تھا ۔ اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا ، واپس جانے پر مجبور کر دیا ۔

پھر دروازے پر دستک ہوئی ۔ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی ۔ پچھلی رات سے اس نے سوچ رکھا تھا کہ خالد اپنی دوست لڑکی کو لے کر آئے گا تو وہ اپنی اس عارضی بھابی کے لئے ناشتے کا انتظام کرے گی مگر اس اجنبی نے سب کچھ بھلا دیا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے گڑیا کو تھامے دروازے تک آئی پھر اسے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا ۔

دروازے پر احسن کھڑا ہوا تھا ۔ اسے خلافِ توقع دوبارہ دیکھتے ہی صوفیہ کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی ۔ اسے فوراً ہی دروازہ بند کرنے یا اس کے پیچھے چھپنے کا ہوش نہ رہا ۔ ہو سکتا

ہے کہ اسے ہوش رہا ہو اور یہ عقل آگئی ہو کہ بار بار دروازے پر آنے والے کو مایوس نہ کیا جائے۔

ایسے وقت الجھے ہوئے خیالات کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے احسن نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے دوبارہ تمہیں دیکھنے کی آرزو کی۔ مگر تم نے دروازہ بند کر دیا۔ تمہیں نظر بھر کر دیکھنے کی یہی تدبیر سمجھ میں آئی کہ پھر ایک مرتبہ دروازے پر دستک دوں۔ اب دیکھو کہ میرے دل کی مراد کس طرح پوری ہوئی ہے۔"

صوفیہ ایک دم سے جھینپ کر دروازے کے پیچھے چلی گئی اس وقت احسن کی شرارت پر غصہ بھی آرہا تھا اور ایک انجانی سی مسرت کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ کوئی اسے ایک نظر دیکھنے کیلئے کیسی تدبیریں کر رہا ہے اس دروازے کے باہر کھڑا صرف اسی کے لئے سوچ رہا ہے مگر وہ خود زیادہ دیر تک اسی طرح کھڑی نہیں رہ سکتی تھی وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ اس طرح بار بار نہ آئیں۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

"مجھے بھی اپنی بدنامی کا ڈر ہے پہلے میں نے اطمینان کر لیا ہے کہ یہاں آتے ہوئے مجھے کسی نے دیکھا نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ چلے جائیں، میرا دل گھبرا رہا ہے" اس کی آواز میں لطیف سی لرزش تھی۔

"پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرا دل بھی گھبرا رہا ہے مگر یہ محبت سے آشنا کرنے والی گھبراہٹ ہے جب آشنائی کی بات آئی ہے تو مجھے اپنا نام بتا دو۔ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہیں کس نام سے یاد کروں؟"

گڑیا اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ہائے اللہ کیا اب ایک مرد کی زبان پر میرا نام آئے گا۔ یہ سوچ کر خوشی تو ہوتی ہے مگر ڈر لگتا ہے۔ احسن کی آواز سنائی دی۔

"ایک گڑیا تمہارے سینے سے لگی ہوئی ہے کتنی خوش نصیب ہے وہ۔ چلو اسی گڑیا کا نام بتا دو۔ میرا دل اس گڑیا کا نام پکارے گا تو تم میرے خیالوں میں آجایا کرو گی۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"صوفیہ" شرماتی ہوئی زبان سے اپنا ہی نام ادا ہو گیا۔

"شکریہ۔ اب یہ بتا دو، کیا تم روز اس وقت تنہا رہتی ہو؟ خالہ نے اپنی امی کا ذکر کیا تھا وہ کہاں ہیں؟"

"وہ صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے جاتی ہیں پھر تین بجے واپس آتی ہیں۔"

"پھر ایک بار شکریہ۔ اب میں جا رہا ہوں، کل موقع دیکھ کر پھر آؤں گا۔"

صوفیہ نے گھبرا کر کہا۔ "نن۔ نہیں۔ آپ نہ آئیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"میں نے کہا نا مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کر آؤں گا۔ تم اطمینان رکھو تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

شاید وہ چلا گیا۔ صوفیہ دروازے کے پیچھے سے نکل کر اسے نہ دیکھ سکی۔ وہ شرمیلی لڑکی تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب وہ اپنے بھائی اور زبیدہ کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ پتہ نہیں وہ آنے والے کہاں گم ہو گئے تھے اور جس کے آنے کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی وہ دوبارہ اس کے دل کے دروازے کو کھول چکا تھا۔

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھ کر شیشے کی دیوار کھڑی کر دی۔ اب گڑیا کی عمر اس میں سما گئی تھی پہلی بار ایک مرد کی تعریفی نگاہوں نے اس کی عمر کا تعین کیا تھا۔ اسے گڑیا کی طرح کم از کم سولہ سال کی نہ سہی بیس سال کی سمجھ کر بہل گیا تھا۔ حالانکہ خالد ستائیس سال کا تھا اور وہ خالد سے تین سال بڑی تھی اس طرح عمر کا حساب لگانے سے دل بیٹھنے لگتا تھا۔ وہ جلدی سے پلٹ کر دیوار پر لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے کے پاس گئی۔ آئینہ اسے احسن کی نظروں سے دیکھنے لگا اسے اب تک کسی مرد کی نگاہوں نے قریب سے چھو کر نہیں دیکھا تھا وہ بالکل اچھوتی تھی۔ دراصل مرد کی انگلیاں اور اس کی نگاہوں کی حرارت عورت کی عمر بڑھا دیتی ہیں۔ یہ نہ ہو تو اس کے حسن اور اس کی شادابی پر ذرا سی بھی خراش نہیں آتی۔

وہ دن بڑا خوشگوار تھا کبھی کانوں میں شہنائیاں گونج رہی ہوتیں۔ کبھی دل کی دھڑکنوں کے ساتھ سہاگ کے ڈھولک بج رہے تھے۔ رگ رگ میں نشہ سا گھل رہا تھا۔ دھک دھک دھک

کی آواز کے ساتھ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پھر باگل ہوگئیں۔ شاید وہ جانے والا پھر واپس آگیا تھا وہ لنگڑاتی ہوئی دروازے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب وہ دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنا نہیں کرے گی، فوراً ہی دروازے کے پیچھے چلی جائے گی پھر دماغ نے سمجھایا ہے کہ ایسی حماقتیں کرتے کرتے عمر گزر گئی ہے اب بھی یہی کرے گی تو اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے گی بھلا کون عورت بوڑھی ہونا پسند کرتی ہے اس نے بالکل سامنے ہو کر دروازہ کھول دیا۔

مگر وہ نہیں تھا اس کے سامنے خالد ایک سانولی لڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ صوفیہ نے سمجھ لیا کہ وہ زبیدہ ہی ہوگی۔ زبیدہ نے سر کے دوپٹے کو آگے کی طرف اتنا کھینچ لیا تھا کہ تقریباً آنکھوں تک اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ صوفیہ نے جلدی سے زبیدہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"آؤ۔۔۔ اندر آجاؤ۔ یہ دوپٹے کا گھونگھٹ یوں لگ رہا ہے جیسے سچ مچ میری دلہن بھابی آگئی ہو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی پھر اسے صوفے پر بٹھانے لگی تو خالد نے کہا۔

"تم زبیدہ سے بعد میں باتیں کر لینا پہلے ہمیں ضروری باتیں کر لینے دو۔ ایسا نہ ہو کہ امی آجائیں۔"

"وہ اتنی جلدی نہیں آئیں گی۔" صوفیہ نے زبیدہ کو بٹھانے کے لئے اپنی طرف کھینچا تو دوپٹہ اس کے ہاتھ میں آکر سرک گیا گھونگھٹ والا چہرہ کھل کر سامنے آگیا۔ تب صوفیہ کو پتہ چلا کہ گھونگھٹ کے پیچھے چھپنے والی کی ایک آنکھ پتھر کی ہے اس کی ایک آنکھ پلکیں جھپکتی تھی مگر دوسری آنکھ بالکل ساکت ہو کر کھلی رہتی تھی۔

صوفیہ خود اسے دیکھ کر ساکت ہو گئی اسے پتہ ہی نہ چلا کہ خالد کب زبیدہ کو اس کے سامنے کھینچ کرے گیا۔ وہ تو اپنی زندگی کے آئینے میں زبیدہ کو دیکھ رہی تھی اس کی امی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو اس سے بھی زیادہ جسمانی عیب رکھتی ہیں۔ لیکن وہ لڑکیاں اس کی طرح احساس کمتری میں مبتلا نہیں رہتیں۔ وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں، محنت مزدوری

کرتی ہیں۔ اپنی کمائی سے اپنے جہیز کے لئے سامان جوڑتی ہیں۔ وہ دل برداشتہ ہو کر یہ نہیں سوچتیں کہ انہیں کوئی جیون ساتھی نہیں ملے گا۔ اللہ میاں نے اس دنیا میں سبھی کا جوڑا بنایا ہے زبیدہ کو بھی اپنا جوڑا مل گیا تھا۔ صوفیہ نے گھوم کر دیکھا تو خالد کے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھ کر بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ انسانوں کی اس دنیا میں آگہی کے کتنے ہی دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اسے دیکھنے والی کا دماغ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں تجسس بڑھتا ہی جاتا ہے۔

وہ سوچ رہی تھی اور اس کے دماغ کے بند دروازے پر احسن دستک دیکر بہت کچھ سمجھا رہا تھا جب بہت کچھ سمجھانے سے کچھ کچھ سمجھ میں آیا تو وہ آپ ہی آپ شرمندہ ہوگئی۔

زبیدہ ایک اجنبی لڑکی کی طرح آئی تھی پھر اجنبی کی طرح واپس چلی گئی صوفیہ کے دل میں ڈھیر ساری آرزوئیں تھیں کہ وہ کس طرح اپنی عارضی بھابی سے ڈھیر ساری باتیں کرے گی مگر خالد نے اپنی باتوں میں بہت سارا وقت گنوا دیا تھا، اسی لئے زبیدہ اس سے باتیں کئے بغیر چلی گئی تھی۔ خالد بھی اسے چھوڑنے کے لئے چلا گیا تھا اسے یہ بتانے کا موقع نہیں ملا کہ اس کا ایک دوست احسن اس سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ تین بجے کے بعد اس کی امی واپس آئیں تو بیٹی کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئیں۔ ماں نے پہلی بار اس چپ چپ سی رہنے والی لڑکی کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ دیکھی تھی مسکراہٹ کھل کر سامنے آئے تو عام سی خوشیوں کا اظہار ہوتا ہے جوان لڑکی کے ہونٹوں پر چھپ چھپ کر آئے تو کوئی خاص بات ہوتی ہے وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے؟

زمانہ شناس بوڑھی ماں پہلے تو اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ ٹوٹے ہوئے صوفے پر آرام سے بیٹھ گئی۔ پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔

"صوفی! یہاں آؤ بیٹی! ذرا میرے پاس بیٹھو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ تمہیں چپ چاپ مسکراتے دیکھ کر میری تھکن دور ہو رہی ہے۔"

وہ ڈائننگ ٹیبل پر سالن اور روٹیاں رکھ رہی تھی۔ ماں کی بات سن کر اس نے منہ پھیر لیا۔

مسکراہٹ کی جگہ گھبراہٹ نے لے لی کہ شاید ماں نے چوری پکڑ لی ہے ۔ ماں نے پھر آواز دی ۔

"کیا میرے پاس نہیں آؤ گی ؟ کہو تو میں تمہارے پاس آجاؤں "

وہ ماں کے پاس جائے یا ماں اس کے پاس آئے ۔ بات ایک ہی تھی وہ کترا نہیں سکتی تھی ،

اس نے دوپٹے کو سر پر سنبھالتی ہوئی ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی ۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میری بیٹی کو بہت بڑی خوشی ملی ہے کیا ماں کو اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کرو گی"

"کچھ نہیں امی ! کچھ بھی تو نہیں ہے ۔ پتہ نہیں آپ میرے چہرے پر کیسی خوشیاں دیکھ رہی ہیں ؟"

"بیٹی ! جب میری شادی نہیں ہوئی تھی اس وقت میں بھی بہت سی باتیں اپنی ماں سے چھپایا کرتی

تھی ان دنوں میں اتنی خوبصورت تھی کہ اپنے ہی خاندان کے کتنے ہی چچا زاد ، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی

چُپ چھپ کر مجھے محبت کے پیغام دیتے تھے ایک بار میں اپنے گھر میں تنہا تھی تو اچانک ہی ایک اجنبی

دروازے پر آ گیا تھا ۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اجنبی نہیں رہا ۔ اس لئے کہ میں بیجا شرم کرنے والی لڑکی نہیں

تھی ۔ وہ مجھے اچھا لگا تو میں نے اپنی امی سے کہہ دیا ۔ جانتی ہو کہ وہ اجنبی کون تھا ، وہ تمہارا باپ تھا"

ماں کی باتیں بڑا حوصلہ دے رہی تھیں ۔ صوفیہ کے دل کو اطمینان ہوا کہ اس کی ماں کی زندگی میں

کوئی اجنبی آیا تھا ۔ اچھا تو ایسے اجنبی جیون ساتھی بن جایا کرتے ہیں ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے اگر یہ

بات ماں بیٹی کے درمیان ہے تو کوئی تیسرا بدنام کرنے نہیں آئے گا ۔ بیٹی کو سوچتے دیکھ کر ماں نے کہنا

شروع کیا ۔

"کیا تم باہر گئی تھیں ؟"

"جی نہیں ـــــ میں صبح سے گھر کے اندر ہوں "

"اچھا اچھا ، ماں نے سر ہلا کر کہا ۔ "تو پھر مجھے کوئی بلانے آیا ہو گا "

"آپ کو نہیں خالد کو ،" وہ روانی میں کہہ جاتی ۔ پھر جانے کہاں سے جھجک آ گئی ۔ ماں کریدنے

پر تلی ہوئی تھی ۔ اس نے پھر سر ہلا کر کہا ۔

"اچھا تو خالد کو کوئی بلانے آیا تھا "

"جی ـ جی ہاں "

"اس کا کوئی دوست ہو گا "

"جی ہاں ـ خالد کے ساتھ وہ بھی مل میں کام کرتے ہیں ۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ خالد آج

ڈیوٹی پر ......"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ خالد آج ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے اسی لئے اس کا ایک دوست اس کی خیریت

پوچھنے یہاں آیا تھا ۔ اُسے یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا مگر بات زبان سے پھسل گئی تھی ۔ ماں نے پوچھا ۔

"تم رُک کیوں گئیں ؟ کیا خالد آج پھر ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے ؟"

"آں ۔ وہ گیا ہو گا ، مجھے کیا معلوم میں ـــــ میں کیا کہہ سکتی ہوں "

"تم سب جانتی ہو ۔ بھائی کی باتیں مجھ سے چھپاتی ہو اس نے آج پھر ناغہ کیا ہے ۔ محلے میں

کہیں بیٹھ کر تاش کھیل رہا ہو گا "

"نہیں امی ـــــ وہ تاش نہیں کھیل رہے وہ تو ......"

"دیکھو صوفی ! تم اپنی ماں سے کچھ نہیں چھپا سکتیں ۔ تمہاری معصومیت اور یہ گھبراہٹ مجھے

سب کچھ بتا دیتی ہے مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا بات ہے ؟"

صوفیہ بُری طرح بدحواس ہو گئی تھی اس کا دل سینے کے اندر الٹ پلٹ کر دھڑک رہا تھا ۔

اچانک ماں کو خیال آیا کہ وہ تو بیٹی کی خوشیاں معلوم کرنا چاہتی تھی اب اصل موضوع سے ہٹ کر بیٹے

کے پیچھے پڑ گئی تھی ۔ یہ سوچتے ہی اس نے کہا ۔

"اچھا جانے دو ۔ میں خالد سے پوچھ لوں گی ۔ ابھی مجھے اپنی خوشیوں میں شریک کرو صوفی

ـــــ میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا دوست کیسا ہے ؟ اس کے ساتھ مل میں کام کرتا ہے ، اچھا

کما لیتا ہو گا ۔ تم ایک ہی ملاقات میں اسے نہیں پرکھ سکتیں ۔ میرا بڑھاپا اسے پرکھ لے گا اور آجکل کسی

کو سمجھنے کیلئے بہت زیادہ سمجھ کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ کیا کماتا ہے اور کیا

بچاتا ہے ؟ اس میں سارے جہاں کے عیب ہوں مگر جواری نہ ہو ۔ اس لئے کہ قمار بازی بہت بری لعنت

ہے۔ بعض لوگ جوئے میں اپنی بیویوں کو ہار جاتے ہیں میرا خیال ہے کہ وہ جواری نہیں ہوگا۔ توبہ ہے۔ میں ہی بولتی چلی جا رہی ہوں اور تم چپ بیٹھی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ اس کا نام کیا ہے؟"

"احسن۔ انہوں نے خود ہی اپنا نام بتایا تھا۔"

"تم نے بھی اپنا نام بتایا ہوگا؟"

کہتے ہیں کہ مشرقی مائیں اپنی بیٹیوں سے ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ ایسی باتوں سے بیٹیوں کو بے حیائی کا سبق ملتا ہے۔ مگر شاید مشرقی روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ رشتے مہنگے ہوتے جا رہے ہیں۔ صرف مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے سے مہنگائی کا زور کم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اب روزانہ اجرت پر مزدوری کرنے والے بھی اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں سے دولت لانے والی یا خود اپنی محنت سے دولت پیدا کرنے والی بیوی انہیں مل جائے۔ گھر سنبھالنے والی بھی باہر جا کر کام کرے گی تو دونوں کی کمائی سے زندگی گزر سکتی ہے جب افراد کے سوچنے کا انداز بدلتا ہے تو ان کی روایات بھی بدلتی ہیں۔ معاشرے کا اندرونی ڈھانچہ بھی چپکے چپکے بدلتا ہے چپکے چپکے ہماری مائیں اپنی بیٹیوں کو سمجھاتی ہیں کہ وہ کوئی بھولے بھٹکے دستک دینے آجائے تو کس طرح نئے رشتے کا دروازہ کھول دینا چاہیئے۔ ایسا چور سبق ہر گھر میں پڑھایا جا رہا ہے۔ کوئی تسلیم نہ کرے یہ اور بات ہے۔

جب ماں حوصلہ دے رہی تھی تو بیٹی نے خاموشی سے سر جھکا کر اعتراف کر لیا کہ وہ بھی اپنا نام بتا چکی ہے اس وقت ماں کا دل سینے کی ہانڈی میں کھدبدا رہا تھا۔ وہ ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو عزت و آبرو سے داماد بنانے کیلئے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی اس نے بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کیا اس نے تمہیں دیکھا ہے؟"

"میں انجانے میں دروازہ کھول کر اک دم سے سامنے چلی گئی تھی۔ پھر جلدی سے دروازے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔"

"تم نے جلدی سے دروازہ بند نہیں کیا ہوگا؟"

"نہیں۔ میں گھبرا گئی تھی۔ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی جب وہ باتیں کرنے لگے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت دروازہ بند کرنا چاہیئے یا نہیں۔"

"تم نے اچھا کیا جو دروازہ بند نہیں کیا۔ بیٹی —— تم تو بیسویں صدی میں رہ کر بھی صدیوں پرانی لڑکی ہو۔ تمہیں تو بچے کر کے سمجھانا ہوگا ایسے وقت دروازہ بند کرنے سے تقدیر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں —— ہاں تو اس نے کیا کہا؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں بھی تمہیں کچھ بتا سکوں۔"

اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ احسن کے بات کرنے کا انداز کیسا تھا اسے خاموش دیکھ کر ماں نے پوچھا۔

"اس نے تمہاری تعریف کی ہوگی؟"

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماں نے خوش ہو کر کہا۔

"بس اتنا کافی ہے اب میں خالد سے بات کروں گی۔ یہ لڑکا بالکل ہی ناکارہ ہے اس کی مل میں اور اس کے دوستوں میں کتنے کنوارے ہیں۔ مگر وہ کسی کو دوست بنا کر گھر نہیں لاتا۔ پتہ نہیں یہ جو احسن آیا تھا یہ کنوارا ہے یا شادی شدہ؟ میں خالد سے پوچھوں گی مگر وہ تو کبھی دو گھڑی چین سے بیٹھ کر باتیں نہیں کرتا۔ آج بھی جلدی جلدی ناشتہ کر کے چلا گیا ہے ایسی جلد بازی کرتا ہے جیسے وہ نہیں جائے تو مل کی تمام مشینیں بند ہو جائیں۔ مگر یہ سب دکھاوا ہے۔ وہ کام کرنے نہیں جاتا کہیں بیٹھ کر تاش کھیلتا ہے آنے دو اُسے دیکھ لینا میں کیسی باتیں سناتی ہوں۔"

صوفیہ نے پریشان ہو کر کہا "امی آپ خالد سے کچھ نہ کہیں۔"

"کیوں نہ کہوں اور تم اسے پھر خالد کہہ رہی ہو۔ میں نے ہزار بار سمجھایا ہے کہ کوئی تیسرا نہ ہو تب بھی اسے بھائی جان کہا کرو۔ مگر میری بات تم دونوں بھائی بہن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ چلو بھائی جان کہو۔"

"اچھا آپ بھائی جان سے کچھ نہ کہیں۔"

"کیوں نہ کہوں۔ کیا اسے جواری بننے کی آزادی دے دوں۔"

"امی، بھائی جان تاش نہیں کھیلتے ہیں۔"

"وہ تاش نہیں کھیلتا ہے۔ ڈیوٹی پر نہیں جاتا ہے تو پھر وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟"

صوفیہ کا سر جھک گیا۔ ایک بار اس کے جی میں آئی وہ ماں کو بھائی کے بارے میں سب کچھ بتا دے آخر وہ ماں ہے بیٹے کی محرومیوں اور نامرادیوں کو سمجھ کر خاموش ہو جائے گی۔ جب مائیں بچوں کی خواہشیں پوری کرنے کے قابل نہیں رہتیں تو چپ چاپ تماشا دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ماں اپنی بیٹی کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر اس کی بہت سی چوریاں پکڑ لیتی تھی۔ اس نے کہا۔

"صوفی! تم اپنے بھائی کی کوئی بات چھپا رہی ہو۔"

صوفیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر فوراً ہی نظریں چرانے لگی۔ ماں نے کہا۔

"میں ماہرِ نفسیات نہیں ہوں لیکن اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر ماں باپ کو اتنا سلیقہ آجاتا ہے کہ وہ ان کے مزاج کو سمجھ سکیں اور ان کی سوچ کو پڑھ سکیں۔ جب ہم کسی کی بات کرتے ہیں تو بات ختم ہونے کے بعد اسی کے متعلق سوچتے ہیں۔ ابھی میں خالد کی باتیں کر رہی تھی۔ لہٰذا تم خالد کے بارے میں سوچ رہی ہو اور کچھ چھپا رہی ہو۔"

"کچھ نہیں امی! آپ تو بس پیچھے پڑ جاتی ہیں آپ بھائی جان پر نکتہ چینی کرنے اور انہیں ڈانٹنے ڈپٹنے کے سوا کچھ نہیں جانتیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ روز صبح سے شام تک چیختی ہوئی مشینوں کے ساتھ مشین نہیں بن سکتے۔ لوگ تو گھبرا کر دنیا سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ وہ تو کبھی کبھی اپنی مل سے بھاگتے ہیں آج بہت عرصے کے بعد انہوں نے ناغہ کیا ہے بہت مدت کے بعد وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ....."

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"دوست مذکر ہوتا ہے تم مؤنث کے طور پر یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ ___ اپنی دوست کیا ہوتا ہے؟ یا تو تمہاری زبان کمزور ہے بعض اوقات تم تذکیر کو تانیث بنا دیتی ہو یا وہ سچ مچ کسی تانیث کے ساتھ ___ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ وہ شراب کے نشے میں اکثر فلمی ہیروئنوں کی باتیں کرتا رہتا ہے ___ سچ سچ بتاؤ کیا اس نے اپنی کسی دوست لڑکی کا تذکرہ تم سے کیا ہے؟"

صوفیہ نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟"

"زبیدہ۔"

"زبیدہ کہہ دینے سے میں کیسے سمجھ لوں گی کہ وہ کون ہے؟"

"اس کی ایک آنکھ نہیں ہے۔"

"کیا؟" ماں نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ "کیا فلم کی ہیروئن ایسی ہوتی ہے۔"

"ہماری زندگی میں ایسی ہوتی ہے ___ مجھ میں بھی تو ایک نقص ہے۔"

ماں کو اپنی بیٹی کی لنگڑاہٹ یاد آ گئی۔ ایک ذرا دیر پہلے وہ ساس بن کر اپنی اندیکھی بہو میں کیڑے نکالنا چاہتی تھی۔ ماں بن کر یاد آ گیا کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ قدرت کا مذاق ہے اس مذاق کے آگے صوفیہ اور زبیدہ جیسی لڑکیاں مجبور اور بے بس ہیں وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے مگر میرا بیٹا بہت خوبصورت ہے اسے اچھے گھرانوں کی کتنی ہی خوبصورت لڑکیاں مل سکتی ہیں۔"

صوفیہ نے جواب نہیں دیا ماں اسے خاموش دیکھ کر خود ہی سوچنے لگی۔

"میری طرح دوسرے لڑکوں کی مائیں بھی اسی انداز میں سوچ سکتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو ایک سے ایک حسین لڑکیاں مل سکتی ہیں جو تمام عیبوں سے پاک ہوتی ہیں پھر لنگڑی صوفیہ کو اپنی بہو کیوں بنایا جائے؟"

خود غرضی تو ہر جگہ ہے ہر دل میں ہے انسان کے ہر مفاد میں ہے ماں کے دل نے سمجھایا کہ صوفیہ کے جسم میں ایسا نقص نہیں ہے جیسا کہ زبیدہ میں ہے، جیسا کہ اور دوسری لڑکیوں میں ہو سکتا ہے اپنی بیٹی میں تو عیب ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چلتے وقت لنگڑاتی ہوئی نہیں بلکہ لہراتی اور بل کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مگر بات بیٹے کی ہو رہی تھی اس نے ایسی لڑکی کیوں پسند کی۔ ایسی بہو کو تو ہر وقت کالا چشمہ پہنائے رکھنا ہوگا اگر وہ چشمہ بار بار ٹوٹتا رہا یا ہونے والے بچے توڑتے رہے تو چھوٹی سی تنخواہ میں سے چشمے کے پیسے الگ نکالنے ہوں گے۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔

"آخر اس لڑکے نے زبیدہ میں کیا خوبی دیکھی ہے تم انصاف سے کہو میں اسے بہو کیسے بنا سکتی ہوں؟"

"آپ بہو کیوں بنانا چاہتی ہیں؟ خالد۔۔۔ میرا مطلب ہے بھائی جان تو اس سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"ایں۔۔۔ شادی نہیں کرنا چاہتا؟ تو پھر دوستی کیوں کی ہے؟"

"صرف ضروری باتیں کرنے کیلئے۔"

"ضروری باتیں۔۔۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"وہ اصل بات یہ ہے کہ امی زبیدہ ایک فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتی ہے اس کی فیکٹری بھائی جان کے راستے میں پڑتی ہے اس طرف سے آتے جاتے زبیدہ سے دوستی ہو گئی۔ مگر انہیں راستے میں ضروری باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس لئے آج وہ زبیدہ کو یہاں لے آئے تھے دیکھئے امی! آپ بھائی جان کو کچھ نہ کہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے مجھے اپنا رازدار بنایا ہے مگر میں کیا کروں میرے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ آپ ان سے کچھ نہیں کہیں گی نا؟"

"کیوں نہیں کہوں گی، اُسے آنے تو دو۔ توبہ توبہ گھر میں ایک جوان بہن ہے اور وہ باہر سے ایک جوان لڑکی لے کر آیا تھا۔"

"ضروری باتیں کرنے۔" صوفیہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"تم چپ رہو۔ کیا ضروری باتیں کرنے کیلئے یہی گھر ملا تھا۔ کیا وہ اپنے کمرے میں گیا تھا؟"

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا اس نے دروازہ بند کیا تھا؟"

صوفیہ نے پھر سر ہلا دیا۔ ماں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی "کیسی گھنی لڑکی ہے۔ گڑیا کی طرح ہاں ہاں میں گردن ہلائے جا رہی ہے کیا یہ اندر سے کچھ نہیں سمجھتی ہوگی۔ جب میں جوان تھی تو میں بھی اپنے اندر بہت سے طوفان چھپائے رکھتی تھی اور اوپر سے بے حس بنی رہتی تھی میں اپنی بیٹی کو نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا۔۔۔ آنے دو اسے آج میں اسے سمجھ لوں گی۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ کام کے دوران کبھی وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھیں اور کبھی باورچی خانے میں جا رہی تھیں ایک بار وہ باورچی خانے سے باہر آ کر بولیں۔

"یہ لڑکے تو ماؤں کو پریشان کرنے کیلئے پیدا ہوتے ہیں اس کے لئے سوچتی ہوں تو تمہیں بھول جاتی ہوں۔۔۔ ابھی احسن کی بات سن کر سوچ رہی تھی کہ اس ڈرائنگ روم کا حلیہ بدلنا ہوگا ہم اسے دعوت دیں گے تو وہ یہاں آ کر کیا دیکھے گا؟ ہماری شکستہ حالی سے بددل ہو جائے گا۔ بھیا کا بھاؤ بتلانے سے پہلے شوکیس کو سجانا پڑتا ہے مگر تمہارا بھائی یہ باتیں نہیں سمجھتا۔ وہ تو ایسے الجھا کر رکھ دیتا ہے کہ میں ساری باتیں بھول جاتی ہوں۔ ابھی میں تمہیں ایک خوش خبری سنانے والی تھی۔ دیکھو میں پھر بھول جاؤں گی۔ تم بیچ میں کچھ نہیں بولنا۔ خالد کی بات چھیڑو گی تو میں پھر۔۔۔"

"امی آپ پھر بھول رہی ہیں۔ وہ خوش خبری کیا ہے؟"

"وہ پچھلے دو سال سے جو ٹیچروں کی اضافی تنخواہیں رکی ہوئی تھیں نا؟ وہ کل ہمیں مل جائیں گی۔ نئی حکومت کا بھلا ہو مجھے پورے چوبیس سو روپے ملیں گے یعنی دو ہزار چار سو روپے۔۔۔ مگر تم چوبیس سو یاد رکھو۔ اس طرح تمہیں یاد رہے گا کہ خالد کی عمر چوبیس برس ہے اور اس سے تم چار سال چھوٹی ہو اور ہاں خالد سے روپے کی بات نہ کرنا ورنہ وہ سو پچاس مانگنا شروع کر دے گا میں تمہاری شادی کیلئے یہ روپے رکھ رہی ہوں صرف ڈرائنگ روم کیلئے پانچ سو روپے خرچ کروں گی۔ قسطوں پر نئے صوفے آ جائیں گے لنڈے بازار سے کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے لے آؤں گی۔ تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے گی تو ڈرائنگ روم اک دم سے بدل جائے گا۔ تمہاری

تقدیر بھی بدل جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ صوفیہ شوکیس کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی۔ امی ایسے منصوبے بنا رہی ہیں جیسے وہ سچ مچ دولہا بن کر آئیں گے۔ کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتے ہی اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر سکھیاں گیت گانے لگیں۔ "بنا میرا آئے گا۔۔۔۔ بنے کو چشمِ تصور میں دیکھتے ہی اس نے شرما کر چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپالیا یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خیال کی دنیا میں پہنچ کر سب ہی اپنی لنگڑاتی ہوئی زندگی کو بھول جاتے ہیں۔

خالد شام کو ڈیوٹی کے وقت کے مطابق واپس آیا۔ ماں غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ بہت زیادہ غصے میں بولا نہیں جاتا۔ وہ بھی کئی بار بولتے بولتے رہ گئی۔ خالد ہمیشہ کا لاپروا تھا وہ ماں کو نظر انداز کرکے کوٹ اتارتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تب ماں سے برداشت نہ ہو سکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ ادھر آؤ۔ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کسے پسند کرانے گئے تھے؟ اب جھوٹ نہ بولنا کر ڈیوٹی پر گئے تھے مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی زبان سے سب کچھ کہہ دو۔"

خالد نے گھوم کر صوفیہ کی جانب شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ ماں نے ڈانٹ کر کہا

"اسے کیا دیکھ رہے ہو؟ تم میری بیٹی کو سکھاتے ہو کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولے۔ تمہاری آوارگیوں کو مجھ سے چھپاتی رہے۔ صوفی! تم یہاں سے جاؤ۔"

صوفیہ ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماں نے کہا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ؟"

"آپ سب کچھ جان چکی ہیں اور میں کیا بتاؤں؟"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"آپ ایسے سوال کر رہی ہیں جس کا جواب ایک بیٹا اپنی ماں کے سامنے نہیں دے سکتا۔"

"اور ایک بھائی اپنی بہن کے سامنے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔"

"امی آپ میرا محاسبہ کرنے سے پہلے میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟ کیا میں ساری زندگی خواب دیکھتے دیکھتے یا فلم دیکھتے دیکھتے گزار دوں؟"

"تم فلمیں کیوں دیکھتے ہو؟ یہ فلمیں اخلاق بگاڑ دیتی ہیں۔"

"یہ غلط ہے امی۔ ہماری محرومیاں ہمارا اخلاق بگاڑتی ہیں۔ ہم انسان فطرتاً شکاری عاشق اور جنگجو واقع ہوئے ہیں جب ہمارے اس فطری جذبے کی تسکین نہیں ہوتی تو ہم شکاری عاشق اور جنگجو قسم کے ہیرو کی فلمیں دیکھتے ہیں وہ خطرات میں گھر جاتا ہے تو ہم بھی خطرات میں گھر جاتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو ٹھوکریں مارتا ہے، حالات سے لڑتا ہے اور مہنگائی کے ظالم پنجوں سے اپنی دولت مند حسین محبوبہ کو چھین لیتا ہے تو ایسے وقت ہمارے جذبوں کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہم اپنے اس بوسیدہ سے مکان میں آکر سوچتے ہیں کہ ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ پھر ہماری محرومیاں ہمیں سمجھاتی ہیں کہ اکبر سیٹھ اگر دو لاکھ روپے کماتا ہے تو ہم اپنی محنت سے کم از کم دو سو کما سکتے ہیں۔ اکبر سیٹھ کے پہلو میں دو لاکھ والی محبوبہ آتی ہے ہمارے حصے میں کم از کم ایک لاکھ والی تو آسکتی ہے مگر جب ہمارے حصے کی بات آتی ہے تو اخلاقی قدروں کی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔"

"اخلاقی قدروں کو بھولا نہیں جا سکتا۔ یہ کیسی غیر اخلاقی بلکہ شرمناک حرکت ہے کہ تم نے جوان بہن کو اپنا رازدار بنایا ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ معصوم کتنی محرومیوں کا شکار ہے تمہاری اس حرکت سے اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا؟"

"یہی سوچتے سوچتے اور ڈرتے ڈرتے اتنی عمر گزر گئی۔ اتنی مدت کے بعد یہ سوچ کر ذرا سی جرأت پیدا ہوئی ہے کہ بھوک کے وقت مانگنے سے روٹی نہ ملے تو کسی سے مانگ کر کھائی جاتی ہے یا چرا کر کھائی جاتی ہے میں نے بہت مجبور ہو کر اس سماج کے دسترخوان سے ایک لڑکی کو چرایا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ میں نے بہت بڑی چوری نہیں کی ہے چوری کے بعد بھی جس طرح ہمیں سوکھی روٹیاں ملتی ہیں اسی طرح ایک روکھی پھیکی لڑکی ملی ہے۔"

"میں صوفیہ کی بات کر رہی ہوں اور تم بات بدل رہے ہو۔"

"صوفیہ ایک نادان لڑکی ہے امی۔ نادان ہے، معصوم ہے اور اس شوکیس میں رکھی ہوئی گڑیا کی طرح بے حس ہے۔ میں نے اسے کبھی مسکراتے اور کبھی رنگوں سے محبت کرتے نہیں دیکھا۔"

"اپنے گھر کی لڑکی ایسی ہی نادان اور بے حس نظر آتی ہے مگر وہ اندر سے کیا ہے یہ تم ماں سے زیادہ نہیں جانتے۔ مگر اب تمہیں سب کچھ جاننا اور سمجھنا پڑے گا۔ تمہیں اس کے رشتے کی فکر کرنا ہو گی۔ تمہارا ایک دوست تمہارے ساتھ مل میں کام کرتا ہے اس کا نام احسن ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

"آپ احسن کو کیسے جانتی ہیں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔ وہ بھی میری طرح خواب دیکھتا ہے۔ اس کی تنخواہ مجھ سے پچاس روپے زیادہ ہے۔"

"پھر تو اچھا لڑکا ہے۔" ماں نے جلدی سے کہا۔

"مگر وہ سوچتا ہے کہ جب بیوی آئے گی اور بچے بڑھیں گے تو تنخواہ نہیں بڑھے گی۔ دو چار سو روپے چار روپے کے برابر ہو جائیں گے۔"

"تم اسے کسی دن یہاں لے کر آؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ بیوی بچوں کی تقدیر سے بھی آمدنی بڑھتی ہے۔"

"اگر یہ کوئی لطیفہ ہے تو مجھے ہنسنا چاہیئے۔ اگر اس میں حقیقت ہے تو پھر ہم سب کو بیوی بچوں کی فیکٹریاں کھول لینا چاہئیں۔ ویسے آپ یہ بتائیں کہ آپ احسن کو کیسے جانتی ہیں؟"

"وہ یہاں تم سے ملنے آیا تھا۔ میں گھر پر نہیں تھی۔ صوفی نے دروازہ کھولا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا وہ گھر کے اندر آیا تھا؟"

"نہیں، دروازے پر کھڑا رہا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ صوفیہ نے آپ سے سچ کہا ہے وہ یہاں اندر آیا ہو گا۔"

"اگر میری بیٹی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تو اس جھوٹ پر تمہیں شرمانا چاہیئے کیونکہ پہلے تم نے ایک لڑکی کیلئے اس گھر کا دروازہ کھولا ہے۔"

خالد نے غصے سے منہ پھیر کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صوفیہ بے حیائی پر اتر آئے۔ میں اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔"

"بکواس مت کرو۔ اپنے بدن میں آگ لگتی ہے تو جلن کا احساس ہوتا ہے تمہارے پاس ذرا بھی عقل ہے تو سمجھداری سے کام لو۔ ابھی اس گھر میں آگ نہیں لگی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔ وہ میرے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں نے اس سے معلوم کیا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ احسن اس کی تعریف کر رہا تھا۔"

"کیا وہ میری بہن کی تعریف کر رہا تھا۔ میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔"

"بیوقوف کہیں کے، زبان کھینچنے کے بجائے تم اسے یہاں کھینچ کر کیوں نہیں لاتے۔ میری عقل سے کام کرو۔ وہ یہاں ایک بار آئے گا۔ ہمارے یہاں ایک وقت کا کھانا بھی کھائے گا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر صوفیہ سے باتیں کرے گا تو شادی کیلئے فوراً راضی ہو جائے گا۔"

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہ یہاں آئے اور میں اپنی بہن سے اسے باتیں کرنے کا موقع دوں؟ یہ بے غیرتی ہے۔"

"یہ مصلحت اندیشی ہے۔ تم کیا جانو میں کتنے ہی گھروں میں جھانک کر دیکھتی ہوں۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو سات پردوں میں رکھنے والے والدین بھی حالات سے مجبور ہو کر اپنی بیٹی کو اپنے ہونے والے داماد سے مل بیٹھنے کا موقع دیتے ہیں۔ گھر کی بات گھر ہی میں رہتی ہے باہر والوں کو پتہ نہیں چلتا کہ گھر کی چار دیواری میں تھوڑی دیر کیلئے کورٹ شپ کی اجازت دے گئی ہے۔"

"مگر امی آپ یہ تو سوچئے کہ مجھے کتنی شرم آئے گی۔"

"شرم تو مجھے بھی آئے گی مگر اب میں شرمانے سے زیادہ یہ سوچنے لگی ہوں کہ وہ تیس برس کی ہو چکی ہے اس کے آگے میں اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔ اگر تمہیں شرم آئے تو تم گھر میں نہ رہنا۔ تھوڑی دیر کیلئے باہر چلے جانا۔"

خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دونوں ہی ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل گیا۔ محدود سرمائے کے مطابق قسطوں پر سے صوفے آ گئے۔ دیواریں ڈسٹمپر سے گلابی گلابی سی ہو گئیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹھے کے پردے لگ گئے۔ ان حالات میں اکثر ہمارے گھروں کو کوٹھیوں کی طرح سجایا جاتا ہے۔ تیسرے روز شام احسن کھانے کی دعوت پر آیا تو صوفیہ کو سجا بنا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ تہذیب اور شرافت کے دائرے میں رہ کر ایسا کیا جائے تو بیٹی اور ہونے والے داماد کے لیے لائسنس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

صوفیہ بہت گھبرا رہی تھی۔ احسن بھی اپنی ہونے والی ساس کے سامنے شرما رہا تھا۔ خالد ایک معقول سا بہانہ بنا کر باہر چلا گیا تھا۔

کھانے کی میز پر صوفیہ کی ماں احسن کے سامنے کھانے کی پلیٹیں بڑھاتی ہوئی اپنے اس خاندان کے گن گا رہی تھی جو پہلے بہت اونچا تھا۔ اب نیچا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

" بیٹا تمہارے گھر میں کون کون ہے؟ "

" کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ غریبی نے رشتہ داروں سے ناطہ توڑ دیا ہے۔ صرف ایک چھوٹی بہن ہے سوچتا ہوں پہلے اس کی شادی کر دوں پھر اپنی فکر کروں "

" ارے بیٹا! میرے جیتے جی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری بہن کے ہاتھ پیلے کروں گی۔ کبھی اسے بھی یہاں لاؤ میں ذرا دیکھوں گی کہ میری بیٹی کیسی ہے "

" میں کل ہی یہاں لے آؤں گا۔ مگر آپ کی یہ صاحبزادی خاموش بیٹھی ہیں۔ پتہ نہیں کھانے سے شرما رہی ہیں یا مجھ سے شرما رہی ہیں "

" بیٹا یہ تو جنم کی شرمیلی ہے کبھی اس نے غیر کے سامنے بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ تمہیں غیر نہ سمجھے۔ تم خالد کے دوست ہو۔ اس لئے میرے بیٹے جیسے ہو۔ بیٹی کھاتی ہو باتیں کرتی رہو۔ اب ایسا بھی کیا شرمانا؟ دو دن سے تو احسن کی بڑی تعریفیں کر رہی تھیں "

صوفیہ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ ماں کیسا سفید جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کی زبان سے تعریف کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اس جھوٹ پر وہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ماں نے

گھبراتے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ " میں ابھی آتی ہوں " کہہ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی احسن نے بڑی آہستگی سے کہا۔

" تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں۔ لقمہ چھوٹ جاتا ہے کہو تو میں اپنے ہاتھ سے کھلا دوں؟ "

وہ ایک دم سے سمٹ گئی۔ جیسے وہ حملہ کرنے آ رہا ہو۔ مگر وہ اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا ماں باورچی خانے سے باہر آئی تو اس کے ہاتھوں میں سالن کا ایک بڑا پیالہ تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔

" صوفی۔ میں یہ سالن پڑوسن کو دے کر آ رہی ہوں جب تک تم احسن سے باتیں کرو "

وہ جواب سنے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔ صوفیہ نے گھبرا کر آواز دینا چاہی مگر جتنی دیر میں ہچکچاتی اور حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کرتی اتنی دیر میں ماں جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔

" تمہاری امی بہت سمجھدار ہیں "

احسن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ صوفیہ نے ایک دم سے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو گڑبڑا گئی۔ کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی وہ بھی پیچھے کی طرف الٹ جاتی مگر احسن نے جلدی سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس لمحے کو تھامنا نہیں کہتے۔ اس نے تو اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگایا تھا صوفیہ فوراً ہی سمجھ نہ سکی کہ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے پہلے تو وہ سمجھی کہ گر رہی ہے۔ پھر سمجھ میں آیا کہ سنبھل رہی ہے پھر خیال آیا کہ صدیوں سے دیکھے جانے والے سپنوں کا شہزادہ اسے سنبھال رہا ہے اور وہ اس کے سینے سے لگ گئی ہے۔ سب خواب کی سی کیفیت تھی کھلی آنکھوں کے سامنے تو کبھی کسی نے ایسی جرأت نہیں کی تھی اور نہ ہی خود اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو گلے لگاتی۔

جب تک وہ خواب کی سی حالت میں بہلتی رہی، وہ میٹھی میٹھی سرگوشیوں میں اسے بہلاتا رہا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کی گردن پر، پیشانی پر، آنکھوں پر اور لبوں پر اترتا رہا۔ اس لڑکی پر پہلے کبھی ایسی افتاد نہیں پڑی۔ اجنبی سانسوں کے جھونکے نجانے اسے کہاں اڑائے لئے جا رہے تھے۔ ایک دم سے اس کا سر چکرا گیا۔ اچانک کوئی حادثہ پیش آ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے احسن اسے دونوں بازوؤں

میں اُٹھا کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف سے گھوم کر آیا۔ پھر اسے نئے صوفے پر لٹا دیا۔ اس کے بعد اس کے رخساروں کو پیار سے تھپک تھپک کر آوازیں دینے لگا۔

"صوفی میری جان۔ کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟"

اس کا سر ذرا چکرایا تھا پھر وہ آنکھیں کھول کر آس پاس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کچھ سمجھنے سے پہلے ہی یک بیک تاریکی چھا گئی۔ شاید بجلی کا فیوز اڑ گیا تھا یا پھر پورے علاقے کی بجلی چلی گئی تھی۔ اندھیرے نے اس لڑکی کو اور زیادہ بدحواس کر دیا۔ اندھیرے نے اس کی عمر کو بہت پیچھے لے جا کر پھینک دیا عمر کے اس اندھیرے میں وہ کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کی حالت سے دوچار ہونے لگی نیند کی تاریکی میں خواب اتنا نہیں سمجھاتے جتنا کہ جاگتی آنکھوں کا اندھیرا آہستہ آہستہ سمجھا دیتا ہے۔

وہ بہت دیر تک اس اندھیرے سے اُلجھتی رہی، جو ظالم بھی تھا اور مہربان بھی تھا جو زخم بھی لگاتا تھا اور زخم کو چومتا بھی تھا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے جگنو اڑاتا جا رہا تھا اچانک ہی شوکیس کے پاس گڑبڑ ہوئی۔ ایک جھناکے سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو گہری تاریکی میں دو آنکھیں گھور رہی تھیں وہ بلا تھا۔ پہلے وہ شوکیس پر آ کر کودا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کھانے کی میز کی طرف جا رہا ہے احسن نے ہش کہہ کر اسے بھگا دیا تو وہ فوراً ہی بھاگ گیا۔

مگر اس کے بھاگنے سے کیا ہوتا ہے شیشہ تو ٹوٹ چکا تھا احسن نے اندھیرے میں صوفیہ کو ٹٹول کر دیکھا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے روتی ہوئی گڑیا کو آغوش میں لے کر پوچھا۔

"کیا ہوا میری جان۔ کیوں رو رہی ہو؟"

وہ سسک سسک کر کہنے لگی۔ "میری کانچ کی گڑیا ٹوٹ گئی ہے۔ اللہ میں نے کتنی مدت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ کبھی کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔ مگر اس بلے نے نہ جانے کہاں سے آ کر اسے توڑ دیا ہے۔"

احسن اسے پچکارنے لگا۔ "اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ پگلی اسے تو ایک دن ٹوٹنا ہی تھا۔"

وہ اس کے بازوؤں سے نکل کر وہاں سے اُٹھ گئی۔ پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی شوکیس کی طرف جانے لگی۔ احسن نے اسے آواز دی۔

"کہاں ہو تم؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ گہری تاریکی میں گھورتا رہا۔ پھر اچانک ہی بجلی آ گئی۔ ڈرائنگ روم روشن ہو گیا۔ وہ شوکیس کے پاس ٹوٹی ہوئی گڑیا کو ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی۔ اس گڑیا کے باقی ٹکڑے شوکیس کے اندر بکھرے ہوئے تھے۔ احسن نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"غم نہ کرو، میں تمہیں دوسری گڑیا لا کر دے دوں گا۔"

صوفیہ نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر بڑی آہستگی سے بولی۔

"مجھے گڑیا نہیں چاہئے۔ مجھے آ۔ آپ کی ضرورت ہے۔"

"مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے جب تک ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک ایک دوسرے کے نہیں بن سکیں گے۔"

"میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لوں گی۔"

"میرا ایک ہی دکھ ہے اور وہ میری دکھی بہن ہے جب بھی میں اپنی شادی کے لئے سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھ سے کہتا ہے کہ پہلے بہن کی شادی کرو۔"

"بھائی جان بھی میرے لئے پریشان رہتے ہیں۔" صوفیہ نے کہا۔

"ہر غیرت مند بھائی پہلے اپنی بہن کی فکر کرتا ہے۔ یہ فکر کرتے کرتے میں بوڑھا ہو رہا ہوں مجھے تو سب ہی رشتہ دیتے ہیں مگر میری بہن کا رشتہ کہیں سے نہیں آتا۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ ایسے گھروں میں رشتہ کروں گا، جہاں سے ایک بہن کو اپنے گھر لاؤں گا اور اپنی بہن کو دلہن بنا کر اس کے گھر پہنچا دوں گا۔ پہلے زمانے میں جب سکے رائج نہیں ہوئے تھے تو جنس سے جنس کا تبادلہ ہوتا تھا۔ تہذیبی ارتقاء کے اس دور میں بھی ایسی سودے بازیاں ہو رہی ہیں ہم اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے مسائل اسی طرح حل کر سکتے ہیں میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا لوں گا۔ مگر اس سے پہلے تم اپنے بھائی کو راضی

کر لو کہ وہ میری بہن کو عزت و آبرو سے یہاں لے آئے۔“

”میں ۔۔۔ میں یہ بات بھائی جان سے کیسے کہہ سکتی ہوں۔“

”تم اپنی امی سے کہو۔ تمہاری امی اپنے بیٹے کو راضی کر لیں گی۔“

تبھی ہی ماں کے کھانسنے، کھنکھارنے کی آواز آئی ۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے کھانسی کا الارم بجا رہی تھی۔ احسن جلدی سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ صوفیہ نے جلدی سے اپنا لباس درست کیا، پھر اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔ ماں خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی تھی۔ مگر بیٹی کا حلیہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ بستر کی چادر درست کرنے کے بعد جو شکنیں رہ جاتی ہیں۔ لباس کی شکنیں اور بے ترتیبی سے بندھے ہوئے جوڑے نے ماں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ بوڑھی عورت اس حد تک چھوٹ نہیں دے سکتی تھی۔ مگر وہ پڑوسن کے ہاں جا کر پھنس گئی تھی۔ اس نے پڑوسن کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے یہاں کوئی نوجوان آیا ہے۔ جب اس علاقے کی بجلی چلی گئی تو وہ اٹھ کر آنے لگی مگر پڑوسن نے ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”گھبراتی کیوں ہو۔ صوفیہ نڈر لڑکی ہے بجلی گئی ہے لالٹین جلا لے گی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی میری بیٹی کی شادی ۔۔۔۔۔“

پڑوسن نے اپنی بیٹی کا ذکر چھیڑ کر اسے الجھا دیا۔ وہ اپنی پڑوسن سے یہ کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنی صوفی کو ایک نوجوان کے پاس چھوڑ کر آئی ہے اور اب اندھیرا ہو گیا ہے اور اگر اس نوجوان سے بات نہ بنی تو یہ اندھیرا ہمیشہ کے لئے صوفی کی بوڑھی جوانی پر چھا جائے گا۔

آہ۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ بوڑھی ماں اسے کچھ نہ کہہ سکی، سر جھکا کر باورچی خانے میں چلی گئی جب دوبارہ واپس آئی ـــــ تو احسن جا چکا تھا۔ بیٹی صوفے پر سر جھکائے نڈھال نڈھال سی بیٹھی ہوئی تھی۔ جوڑا کھل کر بکھر گیا تھا۔ ماں اچانک ہی فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔

”ہائے یہ تو نے کیا کیا؟ بیوقوف لڑکی۔ اگر احسن واپس نہ آیا تو کیا ہو گا؟“

صوفیہ صوفے کی پشت کی طرف گھوم گئی۔ پھر اپنے بازو میں منہ چھپاتی ہوئی بولی۔

”وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ کل اپنی بہن کو لے کر آئیں گے۔“ ماں کو ذرا اطمینان ہوا کیونکہ احسن پہلے بھی اپنی بہن کو لانے کی بات کہہ چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”احسن اور کچھ کہہ رہا تھا؟“

”ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ بھائی جان ان کی بہن سے شادی کر لیں وہ بھی ہم ۔ مجھ سے ......“

”اچھا اچھا میں سمجھ گئی۔ یہ اس کی شرط ہے جب وہ اپنی بہن کی بات چھیڑ رہا تھا۔ اسی وقت میں سمجھ گئی تھی ۔ مگر تم بہت نادان ہو۔ تمہاری نادانی کی وجہ سے ہمیں یہ شرط ماننا پڑے گی۔“

صوفیہ چپ چاپ اٹھ کر اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ ماں فرش پر سے اٹھ کر میز پر سے جھوٹے برتن اٹھانے لگی۔ کیسی جھوٹی زندگی ہے یہ؟ اللہ یہ کیسے جھوٹے لوگ ہوتے ہیں معصوم کنواریوں کو جھوٹے برتن کی طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کیا وہ واپس آئے گا؟ یہ سوچ سوچ کر بوڑھی ماں کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

خالد اپنے دستور کے مطابق آدھی رات کے بعد واپس آیا تو وہ اپنے بیٹے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

”کیا ہوا امی۔ احسن سے کچھ بات بنی؟“

”وہ تو بات بن گئی ہے۔ اگر تم چاہو تو فوراً ہی تمہاری بہن کے ہاتھ پیلے ہو سکتے ہیں۔“

”میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے میری محدود آمدنی ہے اسی آمدنی سے کچھ بچا کر اسے دلہن بنایا جا سکتا ہے۔“

”بیٹے ہم جیسوں کے یہاں دولت اور جہیز کے بل پر شادی نہیں ہوتی۔ جہیز سے جہیز کا تبادلہ ہوتا ہے تم احسن کی بہن سے شادی کر لو۔ تمہاری بہن بھی سہاگن بن جائے گی۔ کل وہ اپنی بہن کو لے کر یہاں آئے گا۔ تم اسے دیکھ لینا۔“

”اگر وہ پسند آئی تو؟“

”یہاں لڑکی پسند کرنے کا سوال نہیں ہے۔ اپنے اپنے بہنوئی پسند کرنے کی بات ہے

وہ اپنی بہن کے لئے تمہیں پسند کر چکا ہے تم اپنی بہن کیلئے اسے پسند کر لو۔ اپنے دماغ سے یہ احمقانہ خیال نکال دو کہ تمہاری زندگی میں فلموں جیسی کوئی دولتمند ہیروئن آئے گی خواب کچھ ہوتے ہیں زندگی کچھ اور ہوتی ہے بیٹے۔"

خالد ماں کے پاس سے اُٹھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا اس رات صوفیہ اپنی ماں کے کمرے میں سوتی رہی اور جاگتی رہی۔ ماں نے اسے بتا دیا تھا کہ خالد اپنی شادی کی بات سن کر خاموش ہو گیا ہے صرف اس کے دماغ میں ایک الجھن ہے۔ وہ یہ کہ لڑکی اسے پسند آئے گی یا نہیں؟ صوفیہ ہر کروٹ پر دُعا مانگ رہی تھی کہ جس طرح احسن نے اسے پسند کیا ہے اسی طرح خالد بھی اس کی بہن کو پسند کر لے۔

دُعا مانگتے مانگتے صبح ہو گئی۔ اس روز خالد ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ شاید وہ احسن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس سے باتیں کرنے سے پہلے اس کی بہن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وقت گزرتے کتنی دیر لگتی ہے شام کو احسن اپنی بہن کو لے کر ان کے دروازے پر آ گیا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو صوفیہ اور خالد کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ احسن کے ساتھ اس کی بہن زبیدہ کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دوپٹے کو اپنے چہرے پر کھینچ کر ایک آنکھ کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی خالد کے دل میں آیا کہ وہ اسی وقت چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دے۔ نہیں میں اس سے شادی نہیں کروں گا میرے خوبصورت فلمی خوابوں کا اس طرح مذاق نہ اُڑاؤ۔

مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی اپنی بہن لنگڑاتی ہوئی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ احسن نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بہن زبیدہ ہے۔ یہاں اس مکان کے سامنے آ کر یہ اک دم سے گھبرا گئی تھی اور اندر آنے سے انکار کر رہی تھی میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں پہلے بھی آ چکی ہے تعجب ہے آپ لوگوں نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟"

بوڑھی ماں نے زبیدہ کو یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے پہلے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اس کے بعد صوفیہ کو دیکھا تو وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

"امی یہ وہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ یہ بھائی جان کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔"

یہ سنتے ہی احسن نے چونک کر پوچھا۔

"زبیدہ تم۔ تم خالد کے ساتھ یہاں آئی تھیں؟" پھر اس نے خالد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں آئی تھی؟ تم کب سے میری بہن کو جانتے ہو؟۔ تم کس رشتے سے اسے یہاں لائے تھے؟"

خالد نے کہا "احسن تم جارحانہ انداز میں سوالات نہ کرو۔ تمہاری بہن اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔"

زبیدہ نے چونک کر سر اُٹھایا اور شکایت بھری نظروں سے خالد کو دیکھنے لگی۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکی۔ مگر اس کی نظریں کہہ رہی تھیں یہ خالد مجھے اکیلی کو الزام نہ دو۔ یہاں آنے میں صرف میری مرضی نہیں۔ ہم دونوں کی مرضی تھی۔ اگر ہم نے کوئی جرم یا گناہ کیا ہے تو ہم دونوں مجرم یا گناہگار ہیں۔"

احسن نے کہا "خالد تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ تم دونوں ہی اس بات کے جوابدہ ہو۔ زبیدہ میری بہن ہے میں اس سے سوال جواب کروں گا۔ مگر تمہاری ماں کا فرض ہے کہ وہ تمہارا محاسبہ کرے۔"

ماں نے دونوں کے درمیان آ کر کہا "میں سمجھ گئی۔ تم دونوں بات نہ بڑھاؤ جو ہو چکا ہے۔ اس پر مٹی ڈالو۔ میں زبیدہ کو اپنی بہو بناؤں گی۔"

زبیدہ نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ خالد نے پریشان ہو کر کہا۔

"امی! میں اپنی شادی کا فیصلہ آپ کروں گا۔"

"تو پھر جلدی فیصلہ کرو۔" ماں نے کہا۔

"آپ ذرا صبر سے کام لیں۔ پہلے میں احسن سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

احسن نے کہا "میں تیار ہوں۔ باتیں کرنے کے لئے یہ گھر مناسب ہو گا۔ یا ہم باہر چلیں گے؟"

ماں نے سمجھایا۔ "گھر کی بات گھر ہی میں ہونا چاہیئے۔ میں صوفی اور زبیدہ کو لے کر پڑوسن کے ہاں آدھ گھنٹے کے لئے جاتی ہوں۔ اتنی دیر میں تم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لو۔ آؤ لڑکیو! میرے ساتھ چلو۔"

وہ صوفیہ اور زبیدہ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی خالد نے کہا

بڑھ کر دروازے کو بند کر دیا۔ مگر چٹخنی نہیں چڑھائی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر آتے ہوئے بولا۔

"احسن! شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ شادی کے بعد مرد ہمیشہ کے لئے ایک عورت کے ساتھ بندھ جاتا ہے۔ لہٰذا خوب سوچ سمجھ کر کسی کو اپنانا چاہیئے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے صوفیہ کو کس حد تک شریکِ حیات کے قابل سمجھا ہے؟"

احسن نے جواب دیا۔ "اگر وہ شریکِ حیات بننے کے قابل نہ ہوتی تو آج میں رشتہ مانگنے نہ آتا۔"

"تم رشتہ مانگنے نہیں۔ سودے بازی کے لئے آئے ہو۔"

"یہ بھی درست ہے لیکن سودے بازی کے لئے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ سودا پسند آئے۔ لہٰذا میں نے پہلے صوفی کو پسند کیا ہے۔ اس کے بعد حالات سے مجبور ہو کر تبادلے کا سودا کر رہا ہوں۔ اب تم بتاؤ۔ کیا زبیدہ کو اپنی شریکِ حیات نہیں بناؤ گے؟"

"میں اسے اپنی بیوی بناؤں گا۔ جس کا چال چلن اچھا ہو گا۔ تمہاری بہن ہر روز گھر سے باہر فیکٹری میں کام کرنے جاتی ہے۔ آج سے چار دن پہلے وہ میرے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنوں کے ساتھ ......"

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی احسن نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"بس۔ اس سے آگے میری بہن کو گالی نہ دینا۔ ہم مردوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ جب کسی لڑکی کو بدنام اور ذلیل کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ خود بھی اس کے ساتھ ذلت کی پستیوں میں گر چکے ہیں۔"

خالد نے جواباً ایک گھونسہ اس کے منہ پر جماتے ہوئے کہا۔

"مرد ہر حال میں شریف کہلاتا ہے۔ عورت ایک ذرا سی لغزش کے بعد فاحشہ کہلاتی ہے ہر شخص ایک کھرا اور چمکتا ہوا "سکہ" چاہتا ہے اور تمہاری بہن ایک کھوٹا سکہ ہے۔"

وہ بہن کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اچھل کر خالد کے سینے پر ایک لات ماری خالد لڑکھڑاتا ہوا پیچھے صوفے پر جا گرا۔ پھر صوفے کے ساتھ دوسری طرف الٹ گیا۔ احسن چھلانگ لگا کر اس پر آیا اور اسے اپنے نیچے دبوچ کر اس کے منہ پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"بیوقوف! تیری بہن بھی ایک کھوٹا سکہ بن گئی ہے۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے اپنی بہن کی بے حیائی چھپانے کے لئے میری بہن پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے احسن کو اپنے اوپر سے اچھال دیا وہ الٹ کر فرش پر آیا تو خالد نے اس پر سوار ہوتے ہی تابڑ توڑ گھونسے مارنے کے بعد کہا۔

"میں تجھے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں میں تیری بہن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے اب تو باہر جا کر میری بہن کو بدنام کرے گا مگر میں تجھے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔"

اس نے جھک کر احسن کی گردن دبوچ لی۔ احسن کے ہاتھوں میں بھی اس کی گردن آگئی۔ دونوں زور لگانے لگے۔ دونوں ہی شہ زور تھے کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ کبھی احسن غالب آکر اسے گرا دیتا تھا کبھی وہ احسن کو زیر کر دیتا تھا۔ ماں نے فیصلہ کرنے کے لئے آدھ گھنٹے کا وقت دیا تھا اور فیصلہ بازوؤں کی قوت سے ہو رہا تھا۔ دونوں کے منہ سے اور ناک سے خون رسنے لگا تھا۔ آنکھیں وحشیوں کی طرح ابل پڑ رہی تھیں اور کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔

پندرہ منٹ کی لڑائی میں وہ دونوں نڈھال ہو کر لڑکھڑانے لگے وہ اپنے پیروں پر کھڑے تھے مگر اب ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی اب صرف زبان چل سکتی تھی احسن نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"تم سمجھتے ہو کہ گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنے والی لڑکیاں بدچلن ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گھر اور باہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں ہمارے قدم پہنچتے ہیں وہاں لڑکیوں کی پارسائی خطرے میں پڑ جاتی ہے تم نے اپنی صوفیہ بہن کو برسوں سے اس گھر کی چار دیواری میں شیشے کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا تھا مگر میرے قدم یہاں پہنچ گئے۔ دیکھ لو وہ شوکیس خالی ہے کانچ کی گڑیا ٹوٹ چکی ہے۔"

خالد نے غصے سے کہا۔ "لفاظی نہ کرو۔ اگر تم سچے ہو تو ثبوت پیش کرو۔"

"میں گواہ پیش کر سکتا ہوں اور وہ گواہ تمہاری ماں ہے وہ صوفی کو میرے پاس چھوڑ کر پڑوسن کے ہاں گئی تو اچانک ہی بجلی فیل ہو گئی اور ہم جیسے منہ کے اندھیرے میں پاس ہو گئے۔"

خالد نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ احسن نے کہا۔

"اگر تم ڈھٹائی سے انکار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو مگر حقیقت نہیں بدلے گی۔ ہم جیب تراش نہیں، شیشہ شکن ہیں۔ عزت کے شیشوں کو توڑتے ہیں اس معاشرے کے ایک گوشہ میں ہم کسی کی بہن کو ورغلا کر لے جاتے ہیں تو دوسرے گوشہ میں کوئی ہماری بہن کو لے جاتا ہے۔ ارے اب تو اس شرمناک سچائی کو تسلیم کر لو۔"

خالد ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے شوکیس کے پاس گیا۔ پھر لڑکھڑا کر گر پڑا اور شوکیس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ احسن بھی قریب آ کر شوکیس کا سہارا لیتے ہوئے فرش پر دو زانو ہو گیا۔ اس کے بعد کہنے لگا۔

"تھک کر گر جانے سے بات نہیں بنے گی۔ اگر تم سچائی سے انکار کرو گے تو ہم دونوں کی بہنیں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی رہ جائیں گی، اندھیرا اور بڑھے گا برائی اور پھیلے گی۔ ہم برائی کو ختم نہیں کر سکتے۔ مگر اسے اپنی حد تک روک سکتے ہیں ہم نے جن شیشوں کو توڑا ہے۔ انہیں اپنے طور پر جوڑ سکتے ہیں ان کی مسیحائی کر سکتے ہیں۔"

خالد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں۔ ایک بار صوفی نے کہا تھا کہ دل ہو یا کانچ کی گڑیا انہیں توڑنے کی بجائے سنبھال سنبھال کر رکھنے کا نام زندگی ہے۔"

اسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ بوڑھی ماں صوفیہ اور زبیدہ کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرا گئیں۔ صوفے الٹے ہوئے تھے ان کے پیچھے دور شوکیس کے پاس خالد اور احسن کے چہرے اپنے اپنے لہو میں بھیگے ہوئے تھے ان کے لباس تار تار ہو چکے تھے اور وہ بالکل ہی پاگل نظر آ رہے تھے پھر وہ دونوں ہی پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ ماں نے قریب آ کر پریشانی سے پوچھا۔

"اسے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

صوفیہ دوڑتی ہوئی احسن کے پاس آ گئی۔ زبیدہ خالد کے پاس پہنچ کر اپنے دوپٹے سے اس کے چہرے کے لہو کو پونچھنے لگی وہ دونوں تھوڑی دیر تک قہقہوں کے شور میں اپنی ندامت کو چھپاتے رہے پھر احسن نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خالد نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"فیصلہ ہو گیا۔ ہم ٹوٹے ہوئے دلوں اور ٹوٹے ہوئے شیشوں کے مسیحا بنیں گے۔ اے فنِ شیشہ گری ہمیں آداب زندگی سکھا دے ......"

محبت کی ایک ایسی دردناک کہانی
جسے آپ آنکھوں سے نہیں،
زبانوں سے نہیں، صرف دل
کی دھڑکنوں سے پڑھیں گے

جب پورے چاند کی رت ہوتی ہے اور دودھیا چاندنی میں بھیگی ہوئی سمندر کی لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو بستی کے لوگ حیرانی سے اور عقیدت سے اس ننھے جزیرے کی جانب دیکھتے ہیں جہاں وہ دو بھٹکی ہوئی روحیں آج بھی آ کر ملتی ہیں اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے کبھی یقین کی طرح مستحکم اور کبھی گمان کی طرح مبہم مبہم سی جھلکی جھلاتی رہتی ہیں۔

کوئی بانکا جوان ماہی گیر ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے کہتا ہے۔

"وہ دیکھو ــــ تُراب نظر آ رہا ہے وہ چٹان پر بیٹھا ہوا ہے میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ تُراب ہے"

کوئی البیلی مچھیرن اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے۔

"ہاں ــــ میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ رجو اس کے شانے سے سر ٹیکے بیٹھی ہوئی ہے اس کی کھلی ہوئی زلفیں ہوا میں لہرا رہی ہیں وہ ایک دوسرے کو محویت سے دیکھ رہے ہیں اور چاندنی آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں اتر رہی ہے ......"

"یہ جھوٹ ہے ــــ!" منگو چیختا ہے ــــ اس لئے چیختا ہے کہ رجو اس کے ہاتھ سے ایسے نکل گئی ہے جیسے اناڑی مچھیرے کے ہاتھ سے مچھلی تڑپ کر نکل جاتی ہے سب اسے پاگل سمجھتے ہیں اور وہ سچ مچ پاگلوں کی طرح چیختا ہے۔

"تم سب جھوٹے ہو ــــ رجو کا نام لیکر مجھے جلاتے ہو۔ ستاتے ہو ــــ میں جانتا ہوں وہ مر چکی ہے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس چٹان پر سے اس نے چھلانگ لگائی تھی میری آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی تھی وہ مر چکی ہے ــــ چلے جاؤ یہاں سے ــــ بھاگ جاؤ"

وہ ساحلی ریت پر لڑکھڑاتے ہوئے دوڑتا ہے۔ انھیں مارنے کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہے سب اس سے کترا جاتے ہیں۔ وہ پاگل ہے پاگل کے منہ کون لگتا ہے۔ وہ آپ ہی دوڑتا ہے اور آپ ہی گرتا ہے ریت میں دھنس جاتا ہے اور اٹھتا ہے پھر بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے تو سیپیاں اور گھونگھے اٹھا اٹھا کر ننھے جزیرے کی طرف یوں پھینکتا ہے جیسے رجو اور تُراب کو

نشانہ بنا رہا ہو یا چاند پر خاک اڑا رہا ہو۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہی تھک ہار کر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔

وہ ننھا سا جزیرہ ساحل سے دور ہے دراصل وہ جزیرہ نہیں ہے سو گز کے رقبے میں پھیلی ہوئی ایک چٹان ہے جو سمندر کی ہتھیلی پر ابھر آئی ہے جب سمندر شانت ہوتا ہے اور لہریں پرسکون رہتی ہیں تو چاندنی راتوں میں مچھیرے اپنی کشتیاں سمندر میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ وہاں جا کر زندگی کی کچھ خوشیاں چرا لیتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے بولتے ہیں اور سمندر اور انسان کے صدیوں پرانے رشتوں کے لوک گیت گاتے ہیں۔

ایسا اکثر نہیں ہوتا بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جوار بھاٹا کے وقت لہریں غضب ناک ہو جاتی ہیں سینکڑوں فٹ کی بلندی تک اٹھتی اور بپھرتی ہوئی آتی ہیں اور اس چٹانی جزیرے کو تھوڑی دیر کیلئے نگل جاتی ہیں۔

ملاح اور مچھیرے سمندر کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کب جوار بھاٹا کی تیزی اس جزیرے کو لے ڈوبتی ہے اور کب لہریں شانت ہو کر انھیں خوشیاں منانے کیلئے جزیرے میں آنے کی اجازت دیتی ہیں۔

اس وقت بھی سب کے دل دھڑک رہے ہیں لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی ہیں اور چٹانی جزیرے کی اونچائی کو چھو رہی ہیں۔ رجو جوں کی توں اپنے تُراب کے شانے سے سر ٹیکے بیٹھی ہے۔ سمندر غرّا رہا ہے تُراب اپنی رجو کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور چاندنی لرز رہی ہے۔

چٹان پر رکھی ہوئی کشتی ایک بپھری ہوئی لہر کی زد میں آ کر الٹ گئی ہے اور وہ لہر دو محبت کرنے والوں کو جھنجھوڑتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی ہے۔

"پگلی رجو ــــ آجا ــــ واپس آجا۔ اب کوئی تیرے پیار کے راستے کا پتھر نہیں بنے گا۔ تُراب ــــ! تو بچپن سے سمندر کے مزاج کو سمجھتا ہے ضد نہ کر۔ اپنی محبت کو لیکر آجا۔ اب یہ دنیا والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔"

مگر وہ دونوں خاموش ہیں اور سمندر بول رہا ہے۔ گرج گرج کر بول رہا ہے۔

لہروں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرخچے اُڑ گئے ہیں۔

لہریں اونچی اور اونچی ہو رہی ہیں اور ان کے سروں پر بکھر رہی ہیں۔ پانی کے چھینٹوں میں اور شفاف بوندوں کی جھالروں میں ان کا وجود جھلمل جھلمل ہو رہا ہے۔ چاندنی میں جھلک رہا ہے اور لہروں میں چھپ رہا ہے۔

لہریں بلند ہو گئی ہیں۔ اتنی بلند ہو گئی ہیں کہ وہ چٹانی جزیرہ کسی اژدھے کے منہ میں چلا گیا ہے۔ اب کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں چند ساعت کے لئے رُک گئی ہیں۔

لہریں واپس جا رہی ہیں اب وہ جزیرہ بھکاری کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی ہے چاند چمک رہا ہے چاندنی ویران جزیرے پر بھٹک رہی ہے انھیں تلاش کر رہی ہے۔ کہاں ہو تم دونوں۔۔ چاند کے نیچے چاندنی اور سمندر کی تہہ میں محبت ہے۔

دیکھنے والوں کے سر جھک گئے ہیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے واپس جا رہے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں خواب ہیں اور دلوں میں یقین ہے کہ اگلے ماہ جب چودھویں کا چاند کھلے گا۔ تو تراب اپنی رجّو کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر پھر اس جزیرے میں آئے گا۔ ضرور آئیگا۔

سمندر ــــ! تو انسانوں کو بہا کر لے جا سکتا ہے۔ لیکن محبت کو کبھی نہیں ڈبو سکتا۔

اگلے ماہ ــــ ہاں اگلے ماہ ......

بچّے عام طور سے پہلے امّاں اور ابا بولنا سیکھتے ہیں لیکن رجّو کی زبان پر پہلے چچا اور چچی کا رشتہ آیا۔ کیونکہ جب اس نے آنکھ کھولی تو ماں باپ مر چکے تھے اور زبان کھولی تو پکارنے کیلئے صرف چچا اور چچی ہی رہ گئے تھے۔ بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا چچا بھی غریب تھا غریب اس لئے بھی تھا کہ محنت سے جی چراتا تھا۔ رات کو افیون کی پینک میں رہتا تھا اور صبح دیر تک سوتا رہتا تھا دوسرے مچھیرے آدھی رات کو کشتیاں لے کر سمندر میں جال ڈالنے کیلئے نکل جاتے تھے صبح ہوتے ہی وہ مچھلیوں سے بھری ہوئی کشتیاں لیکر واپس آتے تو ساحل پر اچھا خاصہ میلہ لگا رہتا۔ شہر سے آنے

والے مچھلیوں کے آڑھتی بڑے بڑے ٹرکوں میں آتے تھے مچھلیوں کا سودا ہونے انھیں تولنے اور ٹرکوں میں لادنے کے دوران بڑی گہما گہمی رہتی تھی۔ پان سگریٹ، چائے اور شربت وغیرہ کی عارضی دکانیں کھل جایا کرتی تھیں شہر کے لوگ کھرے دام دیکر چیزیں خریدتے اور مزدوروں کو معقول اُجرتیں دیا کرتے تھے۔ رجّو کی چچی بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مزدوری کرتی تھی۔ کشتیوں کا مال اُٹھا کر ٹرکوں پر لادا کرتی تھی۔

اس کا چچا جب سو کر اُٹھتا اور اپنی جھگی سے باہر آتا تو اس وقت ساحل ویران ہو جاتا تھا۔ ریت پر گاڑیوں کے پہیّوں کے مٹے مٹے نشانات رہ جاتے تھے۔ دور مچھیروں کے بچے سمندر کی لہروں سے کھیلتے رہتے۔ کسی جگہ رجّو لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ریت کے گھروندے بناتی رہتی اور جھگی کے باہر اس کی چچی مچھلیوں میں نمک بھر کر انہیں دھوپ میں سُکھایا کرتی تھی۔ روز کا یہی معمول تھا اس کی چچی محنت کرتی تھی اور چچا بیٹھ کر کھاتا تھا۔

رجّو کا ایک چچازاد بھائی تھا وہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس کی چچی کا عقیدہ تھا کہ اگر حضرت لال شہباز قلندر اس کی منتیں نہ سنتے تو بیٹا کبھی پیدا نہ ہوتا۔ چونکہ وہ منتوں سے مانگا ہوا تھا۔ اس لئے اسے منگو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

رجّو سے اس کی کبھی نہ بنتی تھی وہ نفرت سے کہتی تھی۔

"منگو ــ مانگنے والے کو کہتے ہیں۔ تو بھیک منگا ہے"

وہ اس کی چوٹی کھینچ کر کہتا۔

"بھیک منگی تُو ہے جو میرے گھر میں رہتی ہے اور میرے گھر میں کھاتی ہے"

وہ بچپن ہی سے بڑی حساس تھی کبھی چچی جھڑکتی اور چچا اسے مارتا تو اسے اپنی بدنصیبی اور تنہائی کا احساس ہونے لگتا بہت منگو ان کا بیٹا تھا اس لئے اس کی ہر شرارت قابلِ معافی تھی وہ کسی کی بیٹی نہیں تھی اس لئے سب ہی اس پر اپنا غصہ اتارتے تھے ایسے وقت وہ منہ لٹکائے تراب کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی اور اسے اپنا دکھڑا سنانے لگتی تھی۔

"جب میں چچی کی طرح بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی مزدوری کروں گی۔ اپنا کھانا خود پکاؤں گی۔ ان کی ہانڈی میں جھانکنے تک نہیں جاؤں گی۔ اونہہ! ذرا سا کھلاتے ہیں اور دنیا بھر کی باتیں سناتے ہیں۔"

"تم ایک دبلی پتلی کمزور لڑکی ہو تم سے مزدوری نہیں ہو گی۔ جب میں اپنے باپ کی طرح بڑا ہو جاؤں گا تو سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا پھر وہ مچھلیاں بیچ کر اتنے سارے پیسے لا کر تمہیں دوں گا تم میرے لئے کھانا پکاؤ گی۔"

"ہاں پکاؤں گی۔"

"میرے گھر میں رہو گی؟"

"ہاں — رہوں گی — تم میرے چچا اور چچی کی طرح مجھے مارو گے تو نہیں؟ کبھی نہیں۔ کیا میں نے آج تک تم سے کبھی لڑائی کی ہے؟ نہیں تم بہت اچھے ہو۔"

وہ سب بچپن کی باتیں تھیں۔ دس برس کی رجو یہ نہیں جانتی تھی کہ ان باتوں کے پیچھے پیار کی کتنی مٹھاس ہے وہ محض چچا اور چچی کے ظلم سے اور اپنی بدقسمتی کے دکھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی ایسے وقت تُراب ہی اس کو ایک ہمدرد اور مہربان نظر آتا تھا۔ تراب کی یہ ہمدردی اور اس سے بڑھتا ہوا میل جول منگو کو بُرا لگتا تھا وہ اپنی ماں سے شکایتیں کرتا تھا کہ رجو اس کے ساتھ نہیں کھیلتی ہے اور ہمیشہ اس سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی سے اس پر سختی ہونے لگی کہ وہ تراب کی جھگی کی طرف نہ جایا کرے اگر تراب کھیلنے کے لئے آئے تو اسے منگو کو بھی اس کھیل میں شریک کرنا چاہیئے۔

تراب پندرہ برس کا ہوا تو اپنے باپ کے ساتھ سمندر میں جانے لگا۔ رجو تیرہ برس کی ہو گئی تھی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی ہلکی پھلکی مزدوری کرنے لگی تھی تراب سمندر سے واپس آتا تو وہ اس کی کشتی سے ٹوکریوں میں مچھلیاں بھر کر ٹرک میں لادنے کا کام کرتی۔ اس کے ساتھ مل جل کر جال کو دھوپ میں پھیلاتی جال کی کوئی ڈور کمزور ہو جاتی تو اسے درست کرنے بیٹھ جاتی تراب کا باپ اسے دوسروں سے زیادہ پیسے اور زیادہ مچھلیاں دیا کرتا تھا آمدنی بڑھتے دیکھ کر چچی اس سے محبت سے پیش آنے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں کایا پلٹ گئی اب وہ منگو کو باتیں سنایا کرتی تھی کہ وہ باپ کی طرح نکھٹو ہے صبح مزدوری کرنے کی بجائے ٹرک

والوں سے باتیں کرتا ہے اور ان سے سگریٹ مانگ کر پیتا ہے۔

منگو کو ماہی گیری کے پیشے سے نفرت تھی۔ سمندر کی غضبناک لہروں سے کھیلنا تمام رات چپو چلاتے رہنا۔ اور مچھلیوں کی بساند میں زندگی گذارنا اسے بالکل پسند نہیں تھا وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا وہاں آنے والے شہریوں کی طرح اچھے اچھے کپڑے اور جوتے پہننا چاہتا تھا یہی سپنے دیکھتے دیکھتے ایک روز وہ بستی سے چپ چاپ چلا گیا۔ ماں نے سمجھا کہ بیٹا اس کی جلی کٹی باتیں سن کر کہیں روٹھ کر نکل گیا ہے۔ شام تک بھوک لگے گی تو آپ ہی واپس آجائے گا۔ شام ہو گئی رات گذر گئی دوسرے دن بھی بیٹے کی صورت نظر نہ آئی تو اس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا بستی والے بھی حیران تھے کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے؟ تیسری صبح ایک ٹرک ڈرائیور نے اسے بتایا کہ منگو اس کے ساتھ اس وعدہ پر کراچی گیا تھا کہ دوسرے دن پھر اسی ٹرک میں واپس آجائے گا مگر کراچی پہنچ کر وہ ٹرک ڈرائیور سے کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلا گیا اور جاتے جاتے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے اس کے جمع کئے ہوئے پچاس روپے چرا لے گیا ہے اس کی ماں نے چھاتی پیٹ کر رونا شروع کر دیا۔

میرے بچے کو کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ میں ہر ماہ تمہیں دس روپے دیکر تمہارے پچاس روپے ادا کر دوں گی۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔

"مائی — میں اپنے روپے کے لئے خود ہی اسے تلاش کر رہا ہوں مگر وہ بہت بڑا شہر ہے یہ جو سمندر دیکھ رہی ہو ناں۔ اس سے بھی بڑا شہر ہے سمندر میں چھپی ہوئی مچھلیوں کو پکڑنا آسان ہے مگر کراچی شہر میں کسی چھپے ہوئے آدمی کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے بہت مشکل ہے۔"

رجو نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اللہ کرے وہ ہمیشہ کے لئے کہیں گم ہو جائے اور کبھی نہ آئے جیسے جیسے دن مہینے اور سال گزرنے لگے اسے یقین آ گیا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے منگو واپسی کا راستہ بھول گیا تھا یا وہ بڑا آدمی بننے میں مصروف تھا۔ اس عرصہ میں اس کی چچی اپنے بیٹے کا انتظار کرتے کرتے اس دنیا سے چل بسی۔

تین برس کے دوران رجو آہستہ آہستہ چودھویں کے چاند کی طرح مکمل ہو گئی۔

اب وہ اپنی چچی کی طرح محنت کرتی تھی بستی کے لوگ برسوں پہلے کی دبلی پتلی سی رجّو کو بھول گئے تھے عمر کے اس نئے موڑ پر اس کا روپ رنگ نکھرتا جا رہا تھا وہ مچھلیوں سے بھری ٹوکری اُٹھا کر چلتی تو اس کے جسم میں آپ ہی آپ لہروں کا سا لوچ اور خرام آجاتا۔ صحت ایسی جاذب نظر تھی جیسے وشال سمندر کے خزانے چھپائے پھر رہی ہو۔ سمندر کے سینے پر جال پھینکنے والے نوجوان مچھیرے اب اس پر اپنی نگاہوں کے جال پھینکنے لگے۔ شہر سے آنے والے بیوپاری اور ٹرک ڈرائیور گھوم پھر کر تراب کی کشتی کی جانب آتے تھے اور رجّو سے باتیں کرنے یا کچھ دیر تک اپنی آنکھیں سینکنے کا بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کوئی کھُل کر اس کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ دیتا کیونکہ اس بے سہارا لڑکی پر تراب کی نگاہوں کا پہرہ تھا اور اس کے دل پر بچپن سے اس جیالے کی محبت نقش ہوتی آئی تھی۔

تراب نے جوانی میں خوب اونچا پورا قد نکالا تھا اس کا سینہ چٹان کی طرح چوڑا اور سمندر سے کھیلنے والے بازو فولاد کی طرح مضبوط تھے رجّو کی طرح اس کا رنگ صاف نہیں تھا، سانولا تھا جب وہ مچھلیوں سے بھری کشتی کھیتے ہوئے ساحل پر آتا تو پسینے سے اس کا بدن تانبے کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ مسلسل چپّو چلانے کی وجہ سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلتا رہتا اور جسم سے مچھلیوں کی بساندآتی رہتی۔

شہر سے آنے والے ناک بھوں چڑھا کر رجّو کی پسند پر تنقیدیں کرتے رہتے تھے یہ تو اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے دل کی دھڑکنوں کا فیصلہ ہوتا ہے کوئی ہیرا پسند کرتا ہے اور کوئی کنکر۔ شاہ جہاں نے کنکروں سے مل کر تاریخ کی گود میں محبت کا ایک تاج محل بنایا ہے۔

رجّو پھول تھی اور تراب کانٹا جو پھول کو نہیں چبھتا بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے ـــــ ایک نوجوان مچھیرے نثار نے رجّو کے چچا کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کی۔

"چاچا ـــ رجّو کو مجھے دیدو۔ میں تمہارے بڑھاپے کا بوجھ اُٹھاؤں گا ......"

ایک نثار ہی نہیں تھا کچھ اور بھی نوجوان اور بوڑھے تھے جو رجّو کے چچا کا بڑھاپا برداشت

کرنے اور ہر رات اس کیلئے افیون کا کوٹہ مہیا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے مگر چچا رجّو کا محتاج تھا اس کی کمائی پر پل رہا تھا۔ لہٰذا اس کی پسند کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا تھا۔

رجّو اور تراب کے پیار کا چرچا بستی کی ہر گلی اور ہر گھر میں تھا کوئی عورت اپنی پڑوسنوں میں بیٹھ کر کہتی ـــــ ابھی گھنٹہ بھر پہلے میں نے رجّو کو دیکھا ہے وہ تراب کے ساتھ اکیلی ساحل کے موڑ کی طرف جا رہی تھی ــ ہائے! دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں انھیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آجاتی ہے"

کسی گلی میں تاش کھیلنے والے نوجوانوں میں سے کوئی نوجوان ترپ کا پتہ پھینک کر کہتا۔ ترپ ہمارے ہاتھ میں ہے اور جیت تُراب کی ہو رہی ہے آج رجّو اس کے ساتھ چٹانی جزیرے پر گئی ہے بھئی کچھ بھی کہو۔ وہ بڑا خوش نصیب ہے ہم رجّو پر جان دیتے ہیں اور رجّو اس پر جان دیتی ہے"

کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بوڑھوں میں سے کوئی چلم کا کش لگا کر کہتا۔

یہ بے حیائی ہے۔ ان کا کیا رشتہ ہے کہ وہ اتنی آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں کبھی کشتی کی سیر کرتے ہیں کبھی ساحل پر گھومتے ہیں اور کبھی چٹانی جزیرے پر جاتے ہیں یہ تو کھلی بے حیائی ہے انہیں دیکھ کر ہمارے جوان بچے بھی بہکنے لگیں گے۔

اس کی باتیں سن کر کچھ لوگ تائید میں سر ہلاتے تھے اور کچھ لوگ رجّو اور تُراب کی حمایت کرتے تھے ان کی حمایت کرنے میں بھی ایک مصلحت تھی وہ چاہتے تھے کہ رجّو اور تراب ایک دوسرے سے محبت کریں۔ مگر شادی نہ کریں۔ شادی سے پہلے شیر و شکر ہو جانے والوں میں اکثر تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں ایک دوسرے سے بیزاری بڑھ جاتی ہے اگر رجّو تراب سے بیزار ہو گئی تو کسی دوسرے چاہنے والے کے نصیب جاگ جائیں گے۔

لیکن پیار آخر پیار ہی ہوتا ہے مچھلی کا بیوپار نہیں ہوتا کہ گاہک بدلتے جائیں رجّو اپنی زندگی کی تمام سانسیں تراب سے منسوب کر چکی تھی۔ اسی لئے تراب کی کشتی کے سوا کسی دوسرے کی کشتی پر مزدوری کے لئے نہیں جاتی تھی۔ جب وہ کشتی لے کر جال ڈالنے کے لئے نکل جاتا تو وہ سیدھی لالہ کی دکان پر

آتی تھی اور اس کے دروازے پر دستک دیتی تھی روز کا یہی معمول تھا اس کی دستک سنتے ہی لالہ کی بیوی بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولتی۔

آگئی کمبخت نیند حرام کرنے ــــ جب ساری بستی سو جاتی ہے جب ہم دکان بند کر دیتے ہیں تب ہی اسے تمباکو خریدنا یاد آتا ہے۔ اری تراب سے کیوں نہیں کہتی۔ وہ دن کو خود ہی آ کر اپنے لیے تمباکو خرید لیا کرے گا۔ رجو جواب دیتی۔ نہیں چاچی! وہ خود سے خریدے گا تو بہت زیادہ تمباکو پینے کی عادت ڈالے گا میں تو حساب سے خریدتی ہوں اور حساب سے اسے پینے دیتی ہوں۔ دیکھو نا..... اب جب وہ سمندر سے آتا ہے تو کس بری طرح ہانپتا رہتا ہے تمام رات لہروں سے جنگ کرتے رہنا بچوں کا کھیل نہیں ہے میں مانتی ہوں کہ وہ فولاد ہے پھر بھی اسے زیادہ تمباکو نہیں پینا چاہیے اسلئے میں اسے روکتی ٹوکتی رہتی ہوں وہ بہت اچھا ہے چاچی! میری ہر بات مان لیتا ہے میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے تم تو اسے اچھی طرح جانتی ہو تم نے تو اسے گود میں کھلایا ہے"

"اُف۔ ارے رجو تو بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے اری میں نے تو تجھے بھی گود میں کھلایا ہے میں تو دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں تم دونوں ہی پاگل ہو۔ لے یہ تمباکو کی پڑیا۔ لالہ دکان بند کرنے سے پہلے ہی یہ پڑیا باندھ لیتا ہے کہ نہ جانے تو کس وقت آ دھمکے گی"

لالے کی بیوی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ دوسرا پاگل تراب تھا وہ بھی کسی رات اپنے دوست رمضو کے ہاں پہنچ جاتا تھا رمضو کے آنگن میں بیلے کے پھول کھلتے تھے اس کی بیوی ان پھولوں کو کبھی گجرے کی صورت میں اور کبھی ہار کی صورت میں گوندھ کر رکھتی تھی دروازے پر دستک سنتے ہی وہ بڑبڑاتی ہوئی آتی۔ آ گیا ہماری نیند حرام کرنے۔ ہزار بار سمجھایا کہ شام کو آ کر پھول لے جایا کر ــــ مگر دماغ میں تو بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ تراب جواب دیتا ہے یہ بات نہیں ہے بھابھی۔ آج رجو ذرا ناراض ہو گئی تھی۔ مناتے مناتے یہ وقت ہو گیا اب سے جلدی آیا کروں گا۔

تو جھوٹ کہتا ہے۔ رجو کبھی ناراض نہیں ہو سکتی روٹھنے کی عادت مردوں کو ہوتی ہے تا کہ ہم ہاتھ جوڑ کر انہیں منائیں اور ان کی خوشامد کریں مگر تجھ سے اب بحث کون کرے گا یہ لے گجرا۔

آج اسے رجو کے ہاتھوں میں نہ پہنانا۔ اس کے جوڑے میں لگانا بیلے کی یہ سفید کلیاں اس کے سیاہ بالوں میں خوب کھلیں گی"

اس کی بھابھی نے ہنستے ہوئے وہ گجرا اسے دیا۔ پھر دعائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ تراب رجو کا لایا ہوا تمباکو ایک بڑھنگے پائپ میں رکھ کر سلگا رہا تھا رجو کے جوڑے میں بیلے کی سفید کلیاں مہک رہی تھیں رات خاموش تھی۔ چاند مسکرا رہا تھا اور وہ دونوں ساحل پر کھڑے ہوئے دور اس چٹانی جزیرے کو دیکھ رہے تھے جو لہروں کی مد و جزر میں گھرا ہوا تھا۔

رجو نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ کیسی غضبناک لہریں ہیں کتنی بیدردی سے اس جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں ہم ملاحوں بھری رات میں وہاں جاتے ہیں وہ جزیرہ ہمارے پیار کا شاہد ہے میرے بس میں ہوتا تو میں اسے طوفانی لہروں سے بچا لیتی۔ کبھی اسے ڈوبنے نہ دیتی"

تراب نے پائپ سے ایک کش لیا پھر دھواں چھوڑنے کے بعد کہا۔ وہ وقتی طور پر ڈوبتا ہے پھر ابھر آتا ہے وہ جزیرہ ہمیں سکھاتا ہے کہ محبت چٹان کی طرح اٹل ہو تو کبھی نہیں ڈوبتی۔ ڈوبتی بھی ہے تو حالات کی لہروں میں شرابور رہ کر نکھر آتی ہے پہلے سے زیادہ شفاف ہو کر چاندنی میں جگمگاتی ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے تراب۔ میری بڑی آرزو ہے کہ کبھی چاندنی رات میں وہاں جاؤں مگر چاند نکلتے ہی یہ سمندر کی لہریں پاگل ہو جاتی ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

یہ قدرت کا کرشمہ ہے چاند کی کشش سے لہریں اس کی جانب بلند ہوتی ہیں لیکن زمین کی کشش زیادہ ہے اسلئے وہ ــ لہریں پھر نیچے آ جاتی ہیں لہریں محض کھلونا ہے چاند اور زمین ــــــ اس کھلونے سے کھیلتے رہتے ہیں کھیل ہی کھیل میں ہمارے پیار کا وہ جزیرہ ڈوب جاتا ہے سوچتا ہوں کہیں ہماری محبت بھی طوفانی لہروں میں نہ گھر جائے میں کل ہی تمہارے چاچا کے پاس جاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ ہماری شادی کی تاریخ پکی کر دیں"

رجو نے فرط مسرت سے اس کے بازو کو تھام لیا اسی وقت ایک بہت اونچی لہر چیختی چنگھاڑتی آئی اور اس نے پیار کے اس جزیرے کو حرف غلط کی طرح نگاہوں سے مٹا دیا۔

رجّو اپنے محبوب کے فیصلہ پر خوشی سے مسکرا رہی تھی اور اندر ہی اندر سمندر کی ناانصافی پر گھبرا رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک وہاں کھڑے رہے اور دھیرے دھیرے پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر وہ اپنی جھگیوں کی طرف واپس جانے لگے ان کے سروں پر صاف و شفاف نیلگوں آسمان کا سایہ تھا قدموں تلے ٹھنڈی ریت بچھی ہوئی تھی چاندرات کی سیاہی کو ان کے قریب پھٹکنے سے روک رہا تھا۔ تراب نے رجّو کے ہاتھ کو ایسی مضبوطی اور اتنے اعتماد سے تھام رکھا تھا جیسے ملاح اپنے پتوار کو اور مچھیرا جال کھینچنے کی ڈور کو تھامے رکھتا ہے وہ رجّو کو اس کی جھگی تک پہنچانے جا رہا تھا

جھگی کے سامنے ایک دبلا پتلا سا آدمی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے بڑی شان سے کھڑا ہوا تھا اس نے دھاری دار پتلون اور پھولدار قمیص پہنی ہوئی تھی سر پر کسی کباڑے سے خریدا ہوا ہیٹ رکھا ہوا تھا رجّو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا وہ منگو تھا۔

منگو نے دانت پیستے ہوئے تراب کو دیکھا پھر رجّو سے کہا۔ اچھا تو تم میرے باپ کو افیون کھلا کر اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے جاتی ہو کیا تمہیں ہماری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔؟

تراب نے غصے سے کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو منگو۔۔ رجّو سے میرا رشتہ طے ہو گیا ہے تمہارے باپ نے منظوری دی ہے کل میں یہاں آکر شادی کی تاریخ پکی کروں گا" اونہہ۔۔۔! "اس نے حقارت سے کہا"

وہ افیونی بوڑھا کون ہوتا ہے منظوری دینے والا۔ میری ماں نے بچپن ہی میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہ میری بہو بنے گی"

رجّو نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

ارے جا۔ بڑا آیا مجھ سے شادی کرنے والا۔ چور بدمعاش۔ کل صبح وہ ڈرائیور آئے گا اور تیری گردن پکڑے گا جس کے پچاس روپے چرا کر بھاگ گیا تھا" منگو قہقہہ لگانے لگا۔

اس کے روپے میں نے بہت پہلے دیدیئے ہیں۔ تراب جیسے مچھیرے کی طرح غریب نہیں ہوں ہر ماہ سینکڑوں روپے کماتا ہوں کراچی شہر کا لے دن بس ڈرائیور رہوں اس وقت میری جیب میں

دو ہزار روپے ہیں اتنے روپے کبھی تیرے باپ نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے"۔ وہ ہاتھ نچا کر بولا۔

میرے باپ نے نہیں دیکھے ہیں تو تیرے باپ نے کب دیکھے ہیں جا کے پوچھ لے چاچا سے۔

اس نے افیون کی گولیوں کے سوا دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ہے تو کس برتے پر میرے باپ کا نام لے رہا ہے؟

تراب نے کہا "رجّو۔ تم اس بیوقوف کے منہ نہ لگو میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم اس جھگی میں اس لفنگے کے ساتھ رہو چلو میرے ساتھ چلو۔ وہ رجّو کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگا۔ منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔ ٹھہرو۔۔۔ رجّو کا ہاتھ چھوڑ دو۔ دیکھو تراب میں تم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ۔ ورنہ تم نہیں جانتے میں بہت خطرناک آدمی ہوں"

تراب نے حقارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔۔۔ ایک ہاتھ رکھ دوں گا تو زمین سے اٹھ نہیں سکے گا ہمت ہے تو راستہ روک کر دیکھ لے میں رجّو کو اپنے دوست رمضو کے ہاں لیجا رہا ہوں تو جب تک یہاں رہے گا رجّو وہاں بھابی کے ساتھ رہا کرے گی" یہ کہہ کر وہ رجّو کو ساتھ لیجانے لگا۔ منگو غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے بڑی بے بسی سے تراب کے فولادی جسم کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ٹکرانے کے نتیجے میں شکست اور شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا اس گنوار کو شہری ہتھکنڈوں سے مات دینا ہوگی۔

بستی والوں کے لئے دوسرا دن بہت ہی دلچسپ اور ہنگامہ پرور تھا۔

رجّو اور تراب کے دشمن خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ منگو واپس آگیا ہے تراب کی حمایت کرنے والے اور رجّو کی بھلائی چاہنے والے منگو کو نفرت سے دیکھ رہے تھے وہ شہری لباس میں اینٹھتا اترتا پھر رہا تھا اور جیب سے بڑے بڑے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تعجب ہے۔ اس بستی میں کسی کے پاس سو روپے کی ریزگاری نہیں ہے اب میں اتنے بڑے نوٹ رکھ کر یہاں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں اسی لئے تو میں یہاں نہیں آرہا تھا مگر کمبخت رجّو کا خیال مجھے کھینچ لایا"

اے موسی! تجھے یاد ہوگا میری ماں رجّو سے میری شادی کرنا چاہتی تھی۔ اے بابا تو نمازی ہے۔

دوسروں کو بھی نماز پڑھاتا ہے تو سچ سچ کہہ دے میری ماں نے تجھ سے بھی کہا تھا کہ میرا اور رجّو کا نکاح تو ہی پڑھائے گا۔" "ہاں تو ٹھیک کہتا ہے ......" موسیٰ اور نمازی بابا نے اس کی تائید کی وہ بستی میں پھرتا رہا۔ ایمان والوں کو ایمان کا واسطہ دیتا رہا۔ ضرورتمندوں کے ہاتھوں میں دو چار روپے رکھتا رہا اور ایک سیاسی لیڈر کی طرح تمام لوگوں کو اپنے حق میں ووٹ دینے کے لئے آمادہ کرتا رہا۔ چھوٹی سی بستی میں کچھ ایسی ہی فضا قائم ہو گئی جیسے کوئی زبردست الیکشن ہونے والا ہو۔ صبح شام رجّو، تراب اور منگو کے چرچے ہونے لگے جھگیوں میں، گلیوں میں، ساحل پر، سمندر پر، بہنے والی کشتیوں پر یہی ذکر تھا۔

"رجّو تراب کو چاہتی ہے تراب ہی سے شادی ہو گی۔ رجّو منگو سے منسوب تھی، منگو سے شادی ہو گی

"نہیں ہو گی کبھی نہیں ہو گی۔"

"ضرور ہو گی۔ منگو کے راستے میں آنے والے کا سر کچل دیا جائے گا۔" دونوں طرف کی پارٹیاں لاٹھیاں اور داؤ لیکر ایک دوسرے کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک پارٹی نے کہا۔

"رجّو تراب کے دوست کے ہاں نہیں رہیگی اسے اپنے چچا کی جھگی میں رہنا ہو گا۔" دوسری پارٹی نے جواب دیا۔ "جس جھگی میں منگو رہتا ہے وہاں رجّو نہیں رہے گی جب تک کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔" منگو کے لوگوں نے کہا۔ "اگر وہ منگو کے ساتھ جھگی میں نہیں رہے گی تو پھر تراب کی کشتی پر بھی مزدوری کے لئے نہیں جائے گی جب تک کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔" بستی کے بوڑھے ان کے درمیان آ گئے "ٹھہرو ٹھہرو — آپس میں خون خرابہ نہ کرو۔ رجّو کا فیصلہ پنچایت کرے گی۔ ہم بوڑھوں نے دنیا دیکھی ہے ہم جو فیصلہ کریں گے وہ سب کے لئے قابلِ قبول ہو گا۔"

"کیسے قابلِ قبول ہو گا — ؟ ایک نے کہا رجّو تراب کو چاہتی ہے اس لئے فیصلہ رجّو کے حق میں ہو گا۔" منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"تم سب یہ دیکھتے ہو کہ جوانی میں رجّو نے تراب کو پسند کیا ہے یہ نہیں دیکھتے کہ بچپن سے میری ماں نے اس لڑکی کی پرورش کی ہے اس کے لئے خون پسینہ ایک کیا ہے تاکہ اسے اپنی بہو بنا کر رکھے۔ تم سب میری مرحوم ماں سے ناانصافی کر رہے ہو۔" تراب نے آگے بڑھ کر جواب دیا "ہم تمہاری

ماں کا احسان مانتے ہیں لیکن لڑکی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرے۔"

منگو نے غصے سے ہاتھ جھٹک کر کہا "تو پھر جاؤ رجّو کو بیاہ کر لے جاؤ مگر اس سے پہلے میری ماں کے خون پسینہ کا حساب کرنا ہو گا۔ اگر رجّو ہماری ہوتی تو میں کبھی غیروں کی طرح حساب نہ مانگتا۔ اس نے تین برس میرے باپ کو اپنی کمائی کھلائی ہے مگر میری ماں نے تیرہ برس تک اسے کھلایا ہے کپڑے پہنائے ہیں دکھ بیماری میں اس کے لئے راتیں جاگی ہیں دواؤں کے دام دیئے ہیں۔ ان سب احسانات کی قیمت چکا سکتے ہو تو پھر لیجاؤ رجّو کو —!"

اس کی باتیں سنکر تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ تراب کے حمایتی آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے منگو کے حمایتی طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے۔ ان کے منگو نے بڑی زبردست سیاسی چال چلی تھی تیرہ برس کا احسان چکانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ ایک بوڑھا جو جوان ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے ایک بار رجّو سے شادی کا پیغام بھی بھیجا تھا اور رجّو کے منہ سے گالیاں بھی سن چکا تھا۔ وہ منگو کی اس بات پر بڑا خوش ہوا اس نے مدبرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اپنوں کی پرورش کی جائے تو ان سے حساب نہیں لیا جاتا۔ لیکن رجّو اپنی نہیں رہی۔ وہ کھلم کھلا پرائی بن گئی ہے لہٰذا کسی بھی پرائے شخص کو کچھ دیا جاتا ہے تو اس سے دام وصول کئے جاتے ہیں منگو ٹھیک کہہ رہا ہے رجّو اس کی ماں کی مقروض ہے جب تک وہ تیرہ برس کا قرضہ ادا نہیں کرے گی اس وقت تک تراب سے شادی نہیں کرے گی۔"

"رجّو کیسے قرضہ ادا کرے گی؟" رمضو نے پوچھا "منگو آخر چاہتا کیا ہے؟ وہ صاف صاف کہہ دے اگر وہ روپے چاہتا ہے تو تراب ہزار دو ہزار بھی دے سکتا ہے۔"

منگو نے جواب دیا "کیا میری ماں نے اتنے برسوں میں صرف دو ہزار رجّو کے پیچھے خرچ کئے ہیں —؟ ذرا عقل کے ناخن لو۔ ماں نے جو روپے رجّو پر خرچ کئے وہی روپے میرے لئے جمع کرتی تو آج میں شہر جا کر ایک فسٹ کلاس ٹیکسی قسطوں پر حاصل کر لیتا۔ ایک ٹیکسی قسطوں پر حاصل کرنے کے لئے کم از کم پندرہ بیس ہزار روپے کی ضرورت ہوتی ہے اب تم لوگ خود ہی سوچو اور حساب کرو اگر ماں نے

ہر ماہ رجّو کیلئے سو روپے خرچ کئے ہیں تو اس حساب سے تیرہ برس میں پندرہ ہزار روپے ہو جاتے ہیں۔ لاؤ۔ نکالو پندرہ ہزار اور رجّو کو لیجاؤ۔“

لالہ پرچون والے نے کہا۔ ”رام رام رام۔ ہم بھی قرض لیتے دیتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی کو بچپن سے پالنے میں جو رقم خرچ کی گئی ہے اس رقم کو قرض کے طور پر وصول کیا گیا ہو۔ بھی رجّو کو پالنے والی اس کی چاچی تھی کیا رشتہ داری میں قرض وصول کروگے۔“ منگو نے جواب دیا۔

”رشتہ داری ہوتی تو میں کبھی یہ بات نہ اٹھاتا۔ رجّو خود ہی رشتہ توڑ رہی ہے اس لئے تراب سے رشتہ جوڑنے سے پہلے اسے قرض ادا کرنا پڑے گا۔ صلح صفائی کا یہی ایک راستہ ہے ورنہ قرض ادا کرنے سے پہلے تراب نے رجّو سے شادی کرنے کی کوشش کی تو میرے آدمی کمزور اور بزدل نہیں ہیں یہاں دنگے فساد ہوں گے لوگ زخمی ہوں گے مارے جائیں گے ایک لڑکی کے لئے یہاں جھگیاں جلتی ہوئی نظر آئیں گی۔“

بستی کی عورتیں سہم گئیں۔ انہیں اپنا سہاگ لٹتا اور جھگیاں جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں بوڑھے بھی سمجھ رہے تھے اس فساد کو روکنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ منگو کا مطالبہ پورا کردیا جائے ایک بوڑھے نے کہا۔ ”اس بستی میں کبھی فساد نہیں ہوا۔ ہم ایک لڑکی کیلئے اپنے گھروں کو برباد، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کر سکتے منگو اپنی ماں کی خرچ کی ہوئی واجب رقم مانگ رہا ہے مگر بہت زیادہ مانگ رہا ہے صلح صفائی کے لئے دونوں فریق نرمی سے کام لیں۔ منگو اپنی رقم میں کچھ کمی کردے اور تراب اس کی ادائیگی کے لئے راضی ہو جائے اسی طرح بات بنے گی۔“

منگو نے تراب کی جانب دیکھا اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے مطالبہ میں کچھ کمی کرے گا تب بھی اس مچھلی پکڑنے والے کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی جس کے عوض وہ رجّو کو اپنا سکے۔ اس نے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ بڑے بوڑھے کہہ رہے ہیں اس لئے میں ایک ہزار کم کئے دیتا ہوں۔ رجّو پر ساری زندگی میرا یہ احسان رہے گا۔“ رجّو نے عورتوں کی بھیڑ سے نکل کر کہا۔ ”میں تو کہتی ہوں تیرے احسان پر۔ میں چاچی کے احسان کا بدلہ چکاؤں گی۔ میں ساری زندگی محنت مزدوری کروں گی اور ایک ایک پیسہ جوڑ کر پندرہ ہزار تیرے منہ پر ماروں گی۔“

”اچھی طرح سوچ لے رجّو۔“ منگو نے کہا۔ ”جب تک تو قرض ادا نہیں کرے گی۔ اس وقت تک تو نہ تراب سے شادی کر سکے گی نہ مل سکے گی اور نہ اس سے بات کر سکے گی مجھ سے رشتہ توڑ کر اس سے رشتہ جوڑنے کیلئے پہلے تجھے پندرہ ہزار کی رقم جمع کرنی ہوگی اور تو ایک ایک پیسہ جوڑتے جوڑتے بوڑھی ہو جائے گی۔“ تراب نے کہا۔ ”تو رجّو کو تنہا کیوں سمجھتا ہے میں نے اپنی جھگی کی جگہ ایک پکا مکان بنانے کیلئے اب تک تین ہزار روپے جمع کئے ہیں یہ روپے میں رجّو کو دوں گا اور روز کی آدھی کمائی اس کیلئے بچایا کروں گا۔“ تراب کے دوست رمضو نے کہا۔ ”میرے پاس ایک سو تیس روپے ہیں میں بھی اپنی آمدنی کا ایک حصہ رجّو کیلئے بچایا کروں گا۔ اگلے چار ماہ تک پانچسو روپے دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔“

لالہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میری کوئی اولاد نہیں ہے میں نے اور میری پتنی نے تراب اور رجّو کو گود میں کھلایا ہے۔ آج ان بچوں پر بپتا آئی ہے تو میں بھی ان کی سہایتا کروں گا میں اپنی جمع پونجی سے انہیں دو ہزار روپے دوں گا۔“ نمازی بابا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”میں بارہ برس سے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنانے کے لئے ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں اور پیسے دو پیسے سبھی سے لیتا رہتا ہوں۔ اب تک میں نے ساڑھے چار سو روپے جمع کئے ہیں۔ سچ کہتا ہوں ابھی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں الہام سا نازل ہوا ہے کہ انسان پر آئی ہوئی آفات کو دور کرنے کیلئے چندہ کیا جاتا ہے خدا کے لئے چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا کسی مسجد کا محتاج نہیں رجّو بیٹی ایک گھر کی اور ایک گھر والے کی محتاج ہے۔ میری مخالفت کرنے والے ہزار باتیں مجھے سنائیں گے مگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مسجد کیلئے چھت ڈالنے سے پہلے بیٹی کے سر پر آنچل ڈالوں گا۔“

رجّو کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے سب لوگ لالہ اور نمازی بابا سے متاثر ہو کر ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے رجّو اور تراب نے محبت کی تھی اور لالہ کا دھرم اور نمازی بابا کا مذہب اس محبت کے سنگم پر آکر مل رہے تھے۔ تراب اور رجّو کے حمایتی بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دینے کے وعدے کر رہے تھے۔ منگو اور اس کے حمایتی غصّہ سے انہیں دیکھ رہے تھے ویسے وہ مطمئن تھے کہ اتنی امداد کے باوجود رجّو اور تراب کو پندرہ ہزار تک پہنچنے کیلئے ابھی کئی برس تک محنت کرنی پڑے گی۔

دوسرے دن سے محنت شروع ہوگئی وہ سب ایک نئی لگن سے اور نئے حوصلوں سے دن رات محنت کرنے لگے دوسری طرف منگو کے آدمی ان کے حوصلے پست کرنے کی فکر میں تھے تراب اور اس کے ساتھی زیادہ سے زیادہ مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے تھے دشمن چوری چھپے کبھی ان کے جال کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتے تھے اور کبھی کشتیوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو ان کی دشمنی کا ثبوت نہ ملے۔

ایک بار تراب اور اس کے ساتھیوں نے آمدنی بڑھانے کے لئے مچھلیوں کے دام بڑھائے تو منگو کے ساتھیوں نے دام گرا دیئے ان کے درمیان اچھی خاصی سیاسی پینترے بازیاں چل رہی تھیں دن پر دن گذر رہے تھے رجو بھی زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کیلئے زیادہ سے زیادہ محنت کر رہی تھی اب اس کا کام دمضو کی کشتی پر ہوا کرتا تھا کیونکہ تراب سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی وہ دونوں دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے رات کو منگو کا کوئی جاسوس ساحل پر پہرا دیتا رہتا تھا تاکہ وہ چوری چھپے بھی نہ مل سکیں۔

دمضو کی بیوی روز شام کو بیلے کی کلیاں گوندھ کر رجو کو دیتی اور رجو لالہ کی دکان سے تمباکو کی پڑیاں لا کر دمضو کو دیتی کہ وہ اسے تراب تک پہنچا دے اور تاکید کر دی کہ زیادہ تمباکو نہ پئے کلیجہ جل جاتا ہے پیسے جمع کرنے کے لئے اپنے کھانے پینے میں کمی نہ کرے نہیں تو میں بھی بھوکی رہ کر پیسے جمع کروں گی۔

دونوں ایک دوسرے سے دور تھے اور جتنے دور تھے اتنے ہی اور زیادہ قریب ہوتے جا رہے تھے یعنی جسمانی طور پر دور تھے مگر محبت بھرے پیغامات انہیں تصورات کی دنیا میں قریب لے آتے تھے پھر منگو نے اعتراض کیا کہ تراب پچھلی رات دمضو کے ہاں رجو سے ملنے گیا تھا۔ یہ سراسر جھوٹ تھا رجو اور تراب ایک دوسرے کے سائے کو بھی چھو کر نہیں گذرے تھے لیکن فیصلہ کرنے والوں کو منگو کی بات پر اس لئے یقین آ گیا کہ دمضو تراب کا گہرا دوست تھا اور دوستی کا حق نبھانے کیلئے وہ اپنے دوست کو رجو سے ملنے کا موقعہ فراہم کر سکتا تھا لہذا رجو کو نمازی بابا جیسے ایماندار آدمی کی

سرپرستی میں دے دیا گیا اور وہ دوسرے دن سے شاکر کی کشتی پر کام کرنے لگی جس دمضو سے تراب کے پیغامات ملتے تھے اس کا بھی ساتھ چھوٹ گیا تھا۔

یہ سب کچھ منگو کی جھنجلائی ہوئی کاروائیاں تھیں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صرف چھ ماہ کے عرصے میں وہ دس ہزار روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ تراب اور رجو نے بھی اپنی کامیابی دیکھ کر منگو کے خلاف کوئی جوابی کاروائی نہیں کی۔ اب صرف پانچ ہزار کی بات رہ گئی تھی تراب نے سوچا کہ پندرہ ہزار پورے ہوتے ہی وہ رقم منگو کے منہ پر مارے گا اور رجو سے شادی کرے گا اس کے بعد یہاں منگو کا رہنا دشوار کر دیگا

ویسے اب رجو سے جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی پہلے تو یہ بات تھی کہ تراب کا کوئی نہ کوئی پیغام مل جاتا تھا اور وہ اپنے دل کو سمجھا لیتی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں مگر اب تو وہ بہت دور تھا اتنی دور کہ شاکر کی کشتی سے ایک ننھے کھلونے کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہوں کی گرمی بھی رجو تک نہیں پہنچتی تھی۔

اسے اداس دیکھ کر شاکر نے کہا "میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں مجھے اپنے دل کی بات کہو میں تمہارا پیغام تراب تک پہنچا دوں گا کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہوگی" ایک ہمدرد کو پا کر رجو نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ تراب سے کہو ایک بار مجھ سے مل لے۔ ایک بار ملنے سے کسی کا کیا بگڑے گا اگر دشمنوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوگا۔ وہ ہمیں پھانسی پر تو نہیں چڑھا دیں گے شاکر نے اطمینان دلایا کہ کوئی انہیں نہ دیکھ سکے گا وہ ایسا انتظام کرے گا کہ کسی کو خبر نہ ہوگی۔ آج رات وہ سب سمندر پر جائیں گے وہ تراب سے کہے گا کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ چٹانی جزیرے پر چلا جائے اس کے جانے کے بعد وہ کشتی لے کر ساحل پر آئے گا اور رجو کو اس میں بٹھا کر چٹانی جزیرے پر اس کے محبوب کے پاس پہنچا دیگا

رجو نے احسانمندی سے اسے دیکھا "یہ بہت اچھی تدبیر ہے شاکر۔ تم بہت اچھے ہو بہت اچھے۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے میں اس لئے تمہارے کام آ رہا ہوں کہ تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ہے آج رات تم ساحل کے اس موڑ پر میرا انتظار کرنا۔ جب تمام مچھیرے سمندر پر چلے جائینگے

تو میں کشتی لے کر وہاں آؤں گا میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ کسی کو اس ملاقات کا علم نہ ہو
تم بھی احتیاط برتنا اپنے سائے سے بھی نہ کہنا کہ تم کہاں جا رہی ہو۔"

رجو کے لئے وہ دن گذارنا مشکل ہو گیا وہ بڑی بے چینی سے سورج غروب ہونے کا انتظار
کرتی رہی رات آئی تو جھگی سے نکلنے کی تدبیر سوچتی رہی۔ تدبیر اسی وقت کام آئی جب نمازی بابا عشاءؒ کی نماز
پڑھکر سو گئے وہ دبے پاؤں جھگی سے نکلی۔ اندھیری رات تھی۔ اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا
بلا سے دیکھ لے۔ آج وہ ساری بندشیں توڑ کر ایک بار صرف ایک بار اپنے محبوب سے ملنے کا مصمم ارادہ کر چکی
تھی ساحل پر کشتی تیار تھی۔ شاکر اس کا انتظار کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی بولا۔

"تم نے بہت دیر کر دی۔ تراب تمہارا انتظار کرتے کرتے کہیں مایوس نہ ہو جائے چلو بیٹھو!"

وہ بیٹھ گئی۔ شاکر کشتی کو لہروں کے اتار چڑھاؤ پر کھینچ کر لیجانے لگا جب لہریں کشتی کو سمندر کی طرف
دھکیلنے لگیں تو وہ بھی کشتی پر آ گیا اور پتوار چلا کر اس کا رخ چٹانی جزیرے کی طرف موڑنے لگا۔ رجو کا
دل بری طرح دھڑک رہا تھا تقریباً سات ماہ کے بعد وہ اپنے تراب سے ملنے والی تھی اس نے دور ساحل
کی جانب دیکھا اندھیرے میں وہ بستی اور جھگیاں نظر نہیں آ رہی تھیں ستاروں کی مدھم روشنی میں آس پاس
صرف سمندر کا پانی دکھائی دے رہا تھا۔ چٹانی جزیرہ زیادہ دور نہیں تھا چاندنی کی روشنی میں بستی سے
صاف نظر آتا تھا لیکن وہ چھپ کر جا رہے تھے اس لئے ایک لمبا چکر کاٹ رہے تھے آدھے گھنٹے کے بعد کشتی
جزیرے کے کنارے سے لگ گئی دور ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تراب سائے کی طرح نظر آ رہا تھا رجو کشتی سے
چھلانگ لگا کر کنارے پر آئی اور بے اختیار اسے پکارتی ہوئی دوڑنے لگی۔

"تراب۔ تراب......" قریب پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ منگو تھا۔
اس نے قہقہہ لگا کر کہا "اچھا تو تم تراب سے ملنے آئی ہو۔ آؤ مجھ سے ملو" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس
کی طرف بڑھنے لگا رجو پلٹ کر کشتی کی طرف بھاگی مگر وہاں شاکر راستہ روکے کھڑا تھا وہ بھی دونوں ہاتھ
پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم مجھے دوست سمجھ کر میرے ساتھ
آئی ہو۔ آؤ اب دوست بن کر رہیں......"

وہ دونوں سے کترا کر پیچھے ہٹنے لگی "خبردار۔ میرے قریب نہ آنا۔ جھوٹے مکار فریبی
تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس تنہائی میں میں تم سے ڈر جاؤں گی۔ میں اپنی جان دیدوں گی مگر تمہیں قریب نہیں
آنے دوں گی۔" "ہم بھی جان کی بازی لگا کر یہاں آئے ہیں"، منگو نے کہا۔ "تم سمجھتی ہو کہ پندرہ ہزار لیکر میں
تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا تراب جیت جائے گا اور میں ہار جاؤں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے پندرہ ہزار پر
جسے حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے شکست کھانا پڑے اور بستی والوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے میں تمہیں حاصل کرنا
چاہتا ہوں تمہیں صرف تمہیں۔ آج تم میری ہو گی یا پھر اس سمندر کی تہہ میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤ گی۔"

یہ کہتے ہی وہ رجو کی طرف لپکا۔ رجو بھاگنے لگی دوسری طرف سے شاکر اسے گھیرنے لگا وہ جانتی تھی
کہ ان کے ہاتھ آ گئی تو عزت کی سلامتی ناممکن ہو جائے گی۔ وہ بھاگتی ہوئی دوسرے کنارے پر چلی گئی اور
ہاتھ اٹھا کر بولی "ٹھہرو۔ رک جاؤ۔ آگے بڑھو گے تو مجھے زندہ نہیں پاؤ گے میں کہتی ہوں رک جاؤ۔"

وہ چیخنے لگی۔ منگو نے دانت پیستے ہوئے کہا "ہم تمہیں زندہ کب چھوڑنا چاہتے ہیں ہم اتنے
احمق نہیں ہیں کہ تمہیں بستی والوں سے شکایت کرنے کیلئے یہاں سے واپس لے جائیں۔ آؤ مرنے سے
پہلے ایک بار ہمارے پاس آ جاؤ۔"

رجو نے پل بھر میں فیصلہ کیا کہ ان سے رحم اور ہمدردی کی توقع کرے گی تو پھر ان کے دام
میں آ جائے گی اور عزت کی موت نہیں مر سکے گی یہ فیصلہ کرتے ہی وہ دوڑتی ہوئی ایک اونچی سی چٹان
پر پہنچ گئی وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اسے پکڑنے آ رہے تھے اس نے پلٹ کر ان کی جانب
دیکھا اور آخری بار اپنے محبوب کو پوری قوت سے چیخ کر آواز دی۔

"تو۔ را۔ آ۔ آ۔ آب......"

پھر سمندر کی سطح پر چھپاک کی زوردار آواز آئی اور پانی بلندی پر اڑتا ہوا دور تک بکھرتا
چلا گیا تھوڑی دیر کے لئے ایک گرداب بنا۔ ذرا اچھل سی ہوئی پھر سمندر شانت ہو گیا۔

دوسرے روز بستی کے مرد عورتیں، بوڑھے اور جوان سب ہی حیرانی سے رجو کو پوچھ رہے تھے
اور پریشانی سے اسے تلاش کر رہے تھے بستی کی ایک ایک جھگی کے اندر جا کر دیکھا گیا کہ شاید کسی وجہ سے چھپی

بیٹھی ہو تو گ میلوں دور تک اسے تلاش کرنے گئے کہ شاید اپنی موجودہ پریشانیوں سے گھبرا کر تنہائی اور سکون کی تلاش میں نکل گئی ہو لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

شاکر سہما سہما سا تھا مگر منگو ڈھیٹ بنا ہوا تھا اس نے الزام لگایا کہ تراب نے اسے غائب کر دیا ہے کہیں لے جا کر چھپا دیا ہے تاکہ پندرہ ہزار نہ دینا پڑے اس الزام کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ علی الصباح مچھلیوں سے بھری کشتی لیکر ساحل پر آیا تھا جس سے ظاہر تھا کہ وہ تمام رات سمندر میں جال پھینکتا رہا ہے پھر جبکہ دس ہزار جمع ہو چکے تھے اور باقی پانچ ہزار بھی چند ماہ تک جمع ہونے والے تھے ایسے میں تراب کوئی بے ایمانی نہیں کر سکتا تھا۔

تراب کے ساتھیوں نے منگو پر الزام لگایا کہ اس نے رجو کو غائب کیا ہے ان کا الزام بھی قابل قبول نہ تھا منگو کو چند ماہ کے بعد پندرہ ہزار ملنے والے تھے ایسے میں وہ رجو کو نقصان پہنچا کر اتنی بڑی رقم سے محروم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ رجو اس کی مقروض تھی وہی اسے روپے دیتی جب وہ نہ ہو گی تو اس کا قرض کون ادا کرے گا؟ اور کیوں ادا کرے گا؟

بات کسی کو سمجھ میں نہیں آئی رجو کی گمشدگی ایک راز بن گئی۔ تراب پر عجیب دیوانگی طاری ہو گئی تھی وہ تمام دن بستی کے ایک ایک مرد اور عورت کو پکڑ پکڑ کر پوچھتا تھا۔ تم نے کہیں دیکھا ہے میری رجو کو۔ بتاؤ کہیں تو دیکھا ہو گا آخر وہ اسی زمین پر ہو گی وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی وہ اکیلی مر بھی نہیں سکتی کیونکہ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھائی ہے۔

بستی والے اسے جھوٹی سچی تسلیاں دیتے تھے کہ وہ آئے گی ایک دن ضرور واپس آئے گی۔

بیس میل [illegible]۔ ایک پولیس چوکی سے ایک تھانیدار دو سپاہیوں کے ساتھ آکر تفتیش کر رہا تھا دو روز کی چھان پھٹک کے بعد وہ بھی اس خیال سے متفق ہو گیا کہ اس کی گمشدگی میں کسی کا ہاتھ نہیں ہے وہ خود ہی کہیں چلی گئی۔

تراب یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھا کہ رجو خواہ مخواہ اسے چھوڑ کر کہیں چلی جائے گی وہ دیوانہ وار اسے تلاش کرتا رہا ۔۔ اس کی بھوک پیاس مر گئی تھی اس کے حوصلے مر گئے تھے

اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے وہ راتوں کو ساحل پر ادھر سے ادھر بھٹکتا پھرتا تھا اور اسے پکارتا رہتا تھا۔

"رجو ۔ رج ۔ جو ۔ او ۔ او ......"

جواب میں سمندر کی لہریں تڑپ کر آتی تھیں اس کے قدموں سے لپٹ کر روتی تھیں وہ نہیں جانتا تھا کہ رجو انہیں لہروں میں چھپ کر گھس کر آ رہی ہے اس کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہے اور ناکام و نامراد واپس جا رہی ہے۔ رجو ۔ رج ۔ جو ۔ او ۔ او ......"

رجو پھر بیقراری سے لوٹ پوٹ کر آتی تھی اور اس کے قدموں سے لپٹ کر کہتی تھی۔ ہائے تراب! یہ میں ہوں ۔ میں ۔ مجھے پہچانو ...... !"

لہروں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن پیار کی خاموشی الہام کی طرح دل میں اتر جاتی ہے اس رات بستی کے کچھ لوگوں نے تراب کو ہنستے اور قہقہے لگاتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک تھی جیسے اس نے اپنی محبت کو پا لیا ہو۔ اس رات وہ تنہا کشتی لیکر سمندر پر گیا۔ مچھلیاں پکڑنے کا جال ساحلی ریت پر چھوڑ گیا تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں گیا ہے بعض نے اس کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے ساتھ لیجانے سے انکار کر دیا سب یہ سوچ کر خاموش رہے کہ وہ بیچارہ پریشان ہے اور کچھ دیر کے لئے سکون کی تلاش میں جا رہا ہے۔ اس رات سمندر بادلوں کی طرح گرجتا رہا۔ لہریں تڑپ تڑپ کر شور مچاتی رہیں۔ آدھی رات کے بعد چاند نکل آیا تھا اس نے لہروں میں اور زیادہ ابال آ گیا تھا بستی والوں کا کہنا ہے کہ ایسا بھیانک مدوجزر انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کچھ لوگوں کو ان طوفانی لہروں کے اس پار تراب کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اپنی رجو کو پکار رہا تھا اور سمندر کو للکار رہا تھا۔ "سمندر ۔ اے سمندر ۔ بتا دے میری رجو کہاں ہے؟"

"تیری لہروں میں مجھے اپنے پیار کی خوشبو ملی ہے میں تجھ سے اپنی رجو کو لیکر جاؤں گا۔ تو اپنی گود سے مچھلیوں کے خزانے دیتا ہے آج میں ان خزانوں کی تلاش میں نہیں، محبت کی تلاش میں آیا ہوں بتا میری رجو کہاں ہے؟ میرے مہربان سمندر ۔ ! میرے ظالم سمندر ۔ !"

کچھ لوگ یہی کہتے ہیں کہ انھوں نے تراب کی آوازیں سنی تھیں یا پھر وہ سمندر اور انسان کے دشتوں اور عداوتوں کا صدیوں پرانا لوک گیت تھا جو ان کی سماعت میں گونج رہا تھا دوسری صبح وہ واپس نہیں آیا اس کے کشتی کے چند ٹوٹے ہوئے تختے لہروں میں بہتے ہوئے ساحل پر آگئے۔ بستی پر ماتمی سکوت چھا گیا سب کے سر جھکے ہوئے تھے ہر شخص اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا سب کی زبانیں خاموش تھیں۔ اور وہ غم و غصے سے اور شدید نفرت سے منگو کو دیکھ رہے تھے۔

کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کا تذکرہ لوگوں کی زبان پر رہ جاتا ہے اب کوئی ملاح چاندنی راتوں میں محبت کا کوئی گیت الاپتا تو اس کی آواز میں ایسا درد اور ایسا سوز و گداز پیدا ہو جاتا جیسے اس آواز کے پردے میں تراب پکار رہا ہو اور رجو سسکیاں لے رہی ہو جب دو چار عورتیں ایک جگہ باتیں کرنے بیٹھ جاتیں تو ان کی گفتگو رجو ..... سے شروع ہوتی تھی اور رجو پر ختم ہوتی تھی گفتگو کا اختتام کچھ اس طرح ہوتا۔

"سنا ہے جو نامراد رہ کر اس دنیا سے جاتے ہیں اُن کی روحیں سدا بھٹکتی رہتی ہیں۔"

"ہاں بہن۔ میں نے بھی سنا ہے میری دادی اماں آنکھوں دیکھا واقعہ سنایا کرتی تھیں دادی اماں کی جوانی کی بات تھی۔ کہ ایک عورت اپنے خاوند کی تلاش میں نکلی تھی تن تنہا رن کچھ کے میدان سے گذر رہی تھی۔ دادی اماں بتاتی ہیں کہ وہ بہت بڑا ریگستانی علاقہ ہے تمام دن سورج ایسے جلاتا ہے جیسے سوا نیزے پر آگیا ہو وہ بیچاری پیاس کی شدت سے بے حال ہو گئی۔ ریگستان تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا پاؤں میں چھالے پڑ رہے تھے زبان خشک ہو کر تالو سے چپک رہی تھی وہ دوپہر ڈھلنے سے پہلے ہی بے دم ہو کر گر پڑی۔ ایسی گری کہ پھر نہ اُٹھ سکی۔

شام کو ادھر سے گذرنے والے ایک قافلے کے آدمیوں نے اس کی لاش کو وہیں دفن کر دیا۔ دادی اماں اسی طرف کی رہنے والی تھیں انھوں نے دیکھا ہے کہ وہ رات کو ان کے گاؤں سے گذرتی تھی کسی سے سامنا ہو جاتا تو اس سے پانی مانگتی تھی اور اپنے خاوند کا پتہ پوچھتی تھی

تمام عورتیں اپنی سانسیں روک کر بڑی حیرت سے وہ کہانی سنتی تھیں پھر اس کی تائید میں کہتیں "ہاں بیچاری پیاسی مر گئی تھی اسی لئے اس کی روح پانی مانگتی تھی"

"آہ۔! بیچاری رجو بھی پیاسی تھی خدا کرے کہ وہ زندہ ہو اور کسی پیاسی روح کی طرح بھٹکتی نہ ہو......" سب ہی افسوس کا اظہار کرتیں اور ایسی باتیں کرتیں کہ وہ باتیں رجو کیلئے دعائیں بن جاتی تھیں منگو اس بستی والوں سے بیزار ہو گیا تھا وہ جہاں سے گذرتا تھا وہاں رجو اور تراب کا تذکرہ سنائی دیتا تھا اس نے جھنجھلا کر واپس شہر جانے کا فیصلہ کر لیا اپنے دو چار دوستوں کو اس نے اچھی خاصی رقم ادھار دیدی تھی وہ اسی انتظار میں تھا کہ رقم وصول ہوتے ہی وہاں سے چلا جائے گا ایک رات لالہ دکان بند کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا اس کی بیوی ایک چوکی پر بیٹھی گیتا کا پاٹھ کر رہی تھی اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دونوں چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس دستک کو وہ برسوں سے پہچانتے تھے ہزاروں در کھٹکھٹائے جائیں تب بھی وہ رجو کی مخصوص دستک کو پہچان لیتے اور وہ پہچان رہے تھے۔

"کیا وہ واپس آگئی ہے۔؟" لالے کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ لالہ جواب دینے کے بجائے تیزی سے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور اس کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ باہر کی نیم تاریکی میں وہ کھڑی ہوئی تھی اس کے جسم پر وہی مخصوص لباس تھا۔ پنڈلیوں تک لہراتا ہوا گھگرا، پیٹ سے اوپر بلاؤز اور پتلی ململ کی اوڑھنی گردن کے اطراف دونوں شانوں پر سے ہوتی ہوئی ہوا میں لہرا رہی تھی۔

"اری رجو۔! تو کہاں چلی گئی تھی۔ آ۔ اندر آجا......" لالے کی بیوی نے اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ چپ تھی۔ ایک پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ ان کی طرف اٹھا ہوا اور ہتھیلی یوں پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے کچھ مانگ رہی ہو۔ لالہ نے بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "بیٹی۔ ہم سمجھتے ہیں تو اپنے تراب کے لئے تباکو لینے آئی ہے آہ! ہم کس زبان سے کہیں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔" اس کی بیوی نے کہنی سے ٹہوکا دے کر کہا "کیوں اس کا دل توڑنے والی بات کرتے ہو؟ کیا ثبوت ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے جیسے یہ گئی تھی ویسے ہی وہ بھی گیا ہے اور میں تو کہتی ہوں

کہ وہ بھی آگیا ہے جب ہی تو یہ اس کے لئے تمباکو لینے آئی ہے۔ آجا بیٹی! دو گھڑی بیٹھ کر باتیں کر۔ پھر تمباکو لیکر چلی جانا ......"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی جوں کی توں ساکت کھڑی رہی اس کی ہتھیلی اب تک پھیلی ہوئی تھی ان دونوں کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا جس لڑکی کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی وہ اس وقت بالکل خاموش کھڑی تھی نہ بولتی تھی نہ حرکت کرتی تھی سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی خالی خالی نظروں سے ایک طرف دیکھے جا رہی تھی۔ لالہ کی بیوی نے کہا "میں سمجھ گئی تراب بھی اس کے ساتھ آیا ہے کہیں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ ابھی ہمارے پاس نہیں بیٹھے گی۔ ٹھہر جا۔ میں تمباکو لے آتی ہوں۔"

وہ دکان کا اندرونی دروازہ کھولنے چلی گئی۔ لالہ نے اپنی بیوی کی طرف گھوم کر کہا "ٹھہرو۔ ابھی تمباکو نہ نکالو پہلے یہ تراب کو بلا کر لائے گی پھر اسے اس کے مطلب کی چیز ملے گی یہ اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں کیا کھائے پئے بنا چلے جائیں گے؟" یہ کہہ کر وہ رجّو سے ہمکلام ہونے کے لئے دروازے کی طرف پلٹا۔ مگر وہاں کسی کا وجود نہ تھا۔ دروازے کی چوکھٹ خالی تھی اور باہر دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ "ارے۔ وہ چلی گئی۔ رجّو۔ رجّو......!" دروازے سے باہر آکر اندھیرے میں اسے آوازیں دینے لگا۔

اس کی بیوی لالٹین اٹھا کر تیزی سے چلتی ہوئی آئی "وہ آج نہیں تو کل تراب کے ساتھ یہاں آجاتی۔ تم نے تمباکو دینے سے انکار کر دیا اور وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔" لالہ نے اس کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کہا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی میں ابھی اسے بلا کر لاتا ہوں۔ وہ لالٹین ہاتھ میں اٹھائے اسے آوازیں دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ رات کے سناٹے میں "رجّو ـــ رجّو!" کی آواز دور تک لہراتی جا رہی تھی۔ جھگیوں سے لوگ اٹھنے لگے سوئی ہوئی بستی جاگنے لگی "کون ـ؟ رجّو کو کون پکار رہا ہے؟"

"لالہ کی آواز ہے......" مرد باہر نکل آئے عورتیں دروازوں سے جھانکنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر پھیل گئی کہ رجّو لالہ کے دروازے پر تمباکو مانگنے آئی تھی۔ پھر کتنی ہی لالٹینیں جھگیوں

سے نکل آئیں کسی نے کہا وہ رمضو کے ہاں گئی ہوگی۔ چلو وہاں دیکھ لیتے ہیں۔"

سب کے سب اسی طرف جانے لگے لالا انہیں تفصیل سے رجّو کے آنے اور جانے کا واقعہ سنا رہا تھا جب وہ رمضو کے مکان کے سامنے پہنچے تو اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کی بیوی اندھیری چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی "کیا مل گیا ـ تراب مل گیا ـ؟"

"تراب ـ؟ نہیں تو ـ ہم تو تراب کو نہیں، رجّو کو ڈھونڈنے آئے ہیں کیا وہ یہاں نہیں آئی ہے؟"

"نہیں ـ یہاں ابھی تراب آیا تھا دروازے پر دستک سنتے ہی میں پہچان گئی کہ وہ تراب ہے۔ رمضو سو رہا تھا میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ دو گھنٹے کے بعد وہ سمندر پر جانے والا تھا میں نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ یہاں چوکھٹ کے باہر کھڑا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر مجھ سے کچھ مانگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی رجّو کے لئے بیلے کی کلیاں مانگنے آیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا؟ سب اسے مردہ سمجھ رہے ہیں وہ اس طرح باہر کیوں کھڑا ہے اندر کیوں نہیں آتا؟ اپنی بھابھی سے باتیں کیوں نہیں کرتا۔؟

مگر وہ خاموش رہا ایک لفظ بھی اس کے زبان سے نہ نکلا میرے دماغ میں بات آئی کہ شاید وہ رجّو کو ڈھونڈ کرنے آیا ہے جبھی بیلے کی کلیاں مانگنے آیا ہے۔

میں نے اس سے کہا ٹھہرو۔ میں تمہارے دوست کو جگاتی ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ جا کر رجّو کو لے آئے گا جب تک وہ نہیں آئے گی میں پھول نہیں دوں گی۔ یہ کہہ کر میں کمرے میں گئی اور جب رمضو کے ساتھ واپس آئی تو وہ یہاں نہیں تھا۔ کیا پتہ پھول نہ دینے کی وجہ سے ناراض ہو کر چلا گیا ہو رمضو اسے ڈھونڈنے کے لئے اس کی جھگی کی طرف گیا ہے......"

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی رمضو واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ تراب وہاں نہیں ہے۔

"پھر وہ دونوں کہاں چلے گئے؟" تمام لوگ اپنی اپنی لالٹینیں لے کر چاروں طرف پھیل گئے بستی میں ـ بستی کے باہر ـ اور ساحل پر دور دور تک انہیں تلاش کرتے رہے انہیں آوازیں دیتے رہے اور رات کے سناٹے میں اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سنتے رہے پھر رات کے پچھلے پہر تھک ہار

کر اپنی اپنی جھگیوں میں آکر سو گئے۔

منگو ان کی حماقتوں پر ہنس رہا تھا وہ تراب کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے لیکن رجّو کو سمندر کے گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔

دوسرے دن بستی کے لوگ سو کر اٹھے تو انھیں رات کی باتیں خواب نظر آنے لگیں تراب کو سمندر پر جاتے سب نے دیکھا تھا مگر اسے اور اس کی کشتی کو واپس آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا اس کی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے بتا چکے تھے کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ رمضو کی بیوی پاگل ہے جو اس کی واپسی کا قصہ سنا رہی ہے اسی طرح لالہ کا دماغ چل گیا ہے رات کو نیند کی حالت میں نہ جانے کیسے دیکھ کر رجّو کو پکارتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا"

لوگ مختلف باتیں کرنے لگے کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ وہ دونوں زندہ ہیں لیکن پچھلی رات بستی میں آکر کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کیوں روپوش ہو گئے تھے؟ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی اس لئے کچھ لوگ ان کی باتوں کو جھٹلا رہے تھے۔ پھر ہر رات ان کا انتظار ہونے لگا جب وہ ایک بار آئے تھے تو دوسری بار بھی آسکتے تھے رجّو اپنے تراب کے لئے تمبا کو مانگنے اور تراب اپنی رجّو کے لئے بیلے کی کلیاں مانگنے ضرور آتا۔ لالہ کی بیوی پڑیاں باندھ کر تیار رکھتی تھی رمضو کی بیوی سرِ شام ہی بیلے کی کلیاں ہار اور گجرے کی صورت میں گوندھنے بیٹھ جاتی تھی۔

مگر وہ نہیں آئے۔ لالہ نے افسوس کا اظہار کیا "کاش کہ میں اسی وقت اسے تمباکو دیدیتا وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے اب میرے دروازے پر کبھی نہیں آئے گی"۔ رمضو کی بیوی کا بھی یہی خیال تھا کہ تراب ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور ان کے خیال پر اب بستی لوگ بیزاری سے کہتے تھے کہ سب خیال ہی خیال ہے اس رات کوئی نہیں آیا تھا سب ان کا وہم ہے رفتہ رفتہ اندھیری راتیں گذرنے لگیں چاند ہر رات جوان ہونے لگا ــــــ اور چاندنی میں دیت کے ذرّے چمکنے لگے ایسے ہی وقت رمضو ساحل کی طرف سے دوڑتا ہوا اور چلاتا ہوا بستی کی طرف آیا۔ "وہ آگئے ہیں۔ میں نے انھیں جزیرے پر دیکھا ہے۔

میں نے چیخ چیخ کر آوازیں دی ہیں انھیں واپس آنے کیلئے کہا ہے مگر وہ میری نہیں سن رہے ہیں جلدی چلو۔ کسی طرح انھیں بلاؤ۔ سمندر کی لہریں غضبناک ہو رہی ہیں.......

جو لوگ رمضو کی باتوں پر یقین کرتے تھے اور جو تراب اور رجّو سے دلچسپی رکھتے تھے وہ فوراً ہی دوڑتے ہوئے ساحل پر چلے گئے۔ چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا اور چاندنی جزیرے کو چوم رہی تھی۔ شفاف اور دودھیا چاندنی میں وہ دونوں نظر آرہے تھے وہ پوری طرح واضح نہیں تھے ان کا وجود کچھ ایسا تھا جیسے وہ شیشے کے بنے ہوں جن کے آرپار سمندر کی لہریں دکھائی دے رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے جھلملاتی ہوئی چاندنی تھی جو تراب اور رجّو کی صورت میں مجسّم ہو گئی تھی۔

بستی والے انہیں بچپن سے دیکھتے آئے تھے اس لئے دور سے بھی پہچان رہے تھے اور چیخ چیخ کر انھیں مخاطب کر رہے تھے "تراب۔ کیا پاگل ہو گئے ہو۔ رجّو کو لیکر آجاؤ....." لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی تھیں اور چٹانی جزیرے پر آکر پھسل رہی تھیں۔ رجّو تراب کے شانے سے سر ٹکائے بیٹھی ہوئی تھی اس کی کھلی ہوئی زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور وہ ایک دوسرے کو محبت سے دیکھ رہے تھے۔

لالے کی بیوی نے چیخ کر کہا "رجّو بیٹی۔ آجا۔ واپس آجا۔ اب کوئی تیرے پیار کے راستے کا پتھر نہیں بنے گا۔ نمازی بابا نے ذرا آگے بڑھ کر آواز دی "تراب۔ تو بچپن سے سمندر کے مزاج کو سمجھتا ہے ضد نہ کر۔ رجّو کو لیکر آجا۔ اب یہ دنیا والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سمندر گرج رہا تھا اس وقت جزیرے کے ساحل پر رکھی ہوئی کشتی ایک بپھری ہوئی لہر کی زد میں آکر الٹ گئی اور دو محبت کرنے والوں کو جھنجھوڑتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ لہروں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرخچے اڑ گئے رمضو کی بیوی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور تراب کو پکار رہی تھی۔

"آجا تراب۔ آجا۔ میں نے تیری رجّو کے لئے ہار اور گجرے گوندھ کر رکھے ہیں ارے کیوں اپنی ماں کو رلا رہا ہے....." لہریں بلند ہو گئی تھیں ان کے سروں پر بکھر رہی تھیں پانی کے چھینٹوں میں اور شفاف بوندوں کی جھالروں میں ان کا وجود جھلمل جھلمل ہو رہا تھا۔ چاندنی میں جھلک رہا تھا اور لہروں میں چھپ رہا تھا۔ پھر وہ لہریں بلند ہو گئیں۔ اتنی بلند ہو گئیں کہ وہ جزیرہ کسی اژدھے کے منہ میں چلا گیا

کچھ عورتیں رو رہی تھیں کچھ اپنی آہوں میں آنسوؤں کو چھپا رہی تھیں ۔ رمضو اور اس کے ساتھی وہاں نہیں تھے
انھوں نے بہت پہلے اپنی کشتیاں لیکر جزیرے کی طرف جانے کی کوششیں کی تھیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان
لہروں کی مخالف سمت چپو چلانا ناممکن ہے انھوں نے دوستی میں اور دیوانگی میں ایک کوشش کی تھی
لیکن لہروں نے انھیں اٹھا کر واپس ساحل پر پھینک دیا ۔ اور جب انھوں نے ناکام ہو کر جزیرے
کی جانب دیکھا تو وہ جزیرہ بھکاری کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی نظر آ رہا تھا ۔

• جب پورے چاند کی رات ہوتی ہے اور دودھیا چاندنی میں بھیگی ہوئی سمندر کی لہریں
ساحل چٹانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو وہ دونوں اس جزیرے پر آکر ملتے ہیں مگر وہ منگو کو نظر نہیں آتے
وہ نفرت کا اندھا ہے اس لئے محبت کی چاندنی میں اسے نظر نہیں آتا ۔ وہ نہیں جانتا کہ محبت آنکھوں سے
دیکھنے کی چیز نہیں ہے وہ دلوں میں دھڑکتی ہے دماغ سے سوچی جاتی ہے اور عقیدت کی آنکھوں
سے کبھی لالہ کے دروازے پر کبھی رمضو کی دہلیز پر اور کبھی جزیرے کی چاندنی میں دیکھی جاتی ہے ۔
رجو اور تراب سے محبت کرنے والے ہر ماہ کی چودھویں کو انھیں دیکھتے ہیں اور بڑی عقیدت سے
کہتے ہیں ۔ سمندر تو انسانوں کو بہا کر لیجا سکتا ہے لیکن محبت کو کبھی نہیں ڈبو سکتا ۔
جب تمام لوگ سر جھکا کر چلے جاتے ہیں تو لالے کی بیوی اور تراب کی بھابی آہستہ آہستہ سر جھکا کر
گھٹنے گھٹنے پانی میں آتی ہیں پھر ایک عورت تمباکو کی پڑیا اور دوسری عورت بیلے کی تازہ کلیاں لہروں
میں بہا دیتی ہے ۔ کہیں کسی گوشۂ تنہائی میں کوئی بانکا جوان ماہی گیر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے :" تراب کی قسم
! میں تیرا ہوں صرف تیرا ....
کوئی البیلی مچھیرن اپنے محبوب کے شانے پر سر رکھ کر کہتی ہے :" رجو کی قسم ۔ ! مجھے بھی پیار کا
سلیقہ آگیا ہے آج سے میں تیری ہوں صرف تیری ....

ممتا کی واپسی

ایک نیم مردہ بچے کی تین سگی ماؤں
کی کہانی، وہ مائیں اس بچے کی سلامتی
کے لیے اپنی اپنی ممتا کو سوتیلی ماؤں
کی طرح بھول رہی تھیں۔

طیارے کی کھڑکی کے باہر صاف و شفاف بادل دھوئیں کی طرح بل کھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ پانچ برس کا جانی کھڑکی کے شیشے کو اپنی ننھی انگلیوں سے یوں نوچ رہا تھا۔ جیسے اڑتے ہوئے بادلوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بیچارہ تو ایک ناسمجھ بچہ تھا بڑی عمر کے سمجھدار لوگ بھی ہر چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔

وہ ایک فلائنگ کلب کا طیارہ تھا۔ اس میں صرف ایک پائلٹ اور تین مسافروں کے لیے گنجائش تھی۔ ایک مسافر ننھا جانی تھا۔ باقی دو مسافر اس کے ممی اور ڈیڈی تھے۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے جانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی پانچویں سالگرہ کی خوشی میں اسے ہوائی جہاز کی سیر کرائیں گے۔ سو وعدہ وفا ہو رہا تھا۔

ماں اپنے بیٹے کی طفلانہ حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر قربان ہو رہی تھی۔ ممتا کے جذبے سے مسکراتی ہوئی آنکھیں یوں بھیگی ہوئی تھیں جیسے مسرتوں کے جام لبریز ہو کر چھلکنے کو تیار ہوں۔ باپ کی آنکھوں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد وہ پیارا سا بچہ ان کی گود میں آیا تھا۔ سب ہی بچوں کے ذہن میں یہ تجسس ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں یا اپنے والدین کی گود میں کہاں سے آئے ہیں؟ یہ بہت ہی مشکل سوال ہے۔ دنیا کی کوئی ماں اور کوئی باپ آج تک اپنے بچے کو صحیح جواب نہ دے سکا۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم اللہ میاں کے پاس سے آئے ہو۔

لیکن جانی کے متعلق اس کے والدین خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ ایسے ہی وقت خدا کی دین کا قائل ہونا پڑتا ہے وہ بانجھ عورت کی گود میں بھی پھول کھلا دیتا ہے جانی کی ممی اپنے کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر خوشی سے کھل جا رہی تھی۔ اس نے جانی کو گرم سوٹ پہنا دیا تھا کہ ہلکی سی سرد ہوا بھی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ ماؤں کے پاس ایسا کوئی لباس نہیں ہوتا جسے وہ بچے کو پہنا کر موت کے سرد ہاتھوں سے تمام عمر بچاتی رہیں۔ لے دے کر صرف

دعائیں ہوتی ہیں۔

"خدایا میرے بچے کو قیامت کی طرح لگ جائے زندگی اسے کبھی بری نظر سے نہ دیکھے اور موت ہمیشہ اسے طرح دے جائے۔ خدایا ......"

اچانک ہی جہاز کو ایک جھٹکا سا لگا۔ پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے جہاز کا موٹر ناراض ہو رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ماں باپ کے دل و دماغ کو جھٹکے لگنے لگے۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے جانی کو دیکھا۔ بیٹا بہت خوبصورت تھا۔ والدین کی جان سے زیادہ قیمتی تھا لیکن حادثے کسی کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے۔ جہاز کا موٹر بیمار ہو چکا تھا۔ اس بیمار کو رہ رہ کر کھانسی کے جھٹکے لگ رہے تھے اور جہاز دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ پھر کھڑکی کے شیشے کے پار نیلا آسمان گردش میں آگیا۔ پانچ برس کے جانی کے لئے دلچسپ تماشہ تھا کہ جن سفید بادلوں کو وہ پکڑنا چاہتا تھا وہ اوپر تلے ڈوبتے ابھرتے جا رہے تھے۔ کیا موت اسی طرح جھولا جھولتی آتی ہے؟

پہاڑ کی وہ عمودی سیاہ چٹان یوں کھڑی تھی جیسے انگلی دکھا رہی ہو۔ "خبردار! میری طرف نہ آنا۔ کون جانتا ہے کہ تم ٹوٹ جاؤ گے۔ یا میری انگلی ٹوٹ جائے گی۔ خبردار! آگے نہ بڑھنا ......"

مگر وہ عمودی سیاہ چٹان گویا ایک مقناطیس تھی۔ جہاز اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا جیسے بچپن جوانی کی طرف جوانی بڑھاپے کی طرف اور بڑھاپا موت کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے لیکن جانی تو ابھی بچہ تھا۔ کیا موت بچپن کے حسن کو اور ماں کے دودھ کے چھینٹے کو بھی نہیں پہچانتی؟

یکبارگی زوردار دھماکہ ہوا۔ ایسا زوردار دھماکہ آسمان کے پھٹنے سے نہیں، ماں کی چھاتی پھٹنے سے ہوتا ہے کون جانتا ہے کہ بصد شوق بچے کی سالگرہ منانے والوں پر کیا گزری؟ پہاڑ کی مغرور بلندی پر چند لمحوں کے لئے قیامت برپا ہوئی۔ پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سیاہ عمودی چٹان کی "خبردار" کہنے والی انگلی ٹوٹ چکی تھی۔

*

بانو دکان کے اندر کھلونوں اور کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی اس کی ماں دکان کے باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا رہی تھی۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"صرف ایک روپے میں آپ اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید سکتے ہیں۔"

لوگ آ رہے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے ایک بری فوج کا کیپٹن ٹہلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فوج کی وردی میں وہ بہت ہی اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بانو کی بوڑھی ماں سے کہا۔

"ماں جی۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے فوجی گاڑیاں یہاں سے کسی وقت بھی گزر سکتی ہیں اور آپ نے دکان کا سامان یہاں راستے تک پھیلا دیا ہے۔ پلیز یہ سامان اپنی دکان تک محدود رکھیں۔"

ایسا کہتے وقت اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی دکان کے اندر گئیں۔ پھر بانو پر ٹھہر گئیں۔ وہ گلابی رنگ کے لباس میں گلابی گلابی سی لگ رہی تھی۔ آفیسر سے نظریں ملتے ہی وہ گلابی سے سرخی مائل ہو گئی۔ اجنبی نگاہوں کی دھوپ رنگ حسن کا مزاج بدل دیتی ہے۔ اس کی ماں آفیسر سے معذرت چاہ رہی تھی اور وعدہ کر رہی تھی کہ وہ جلد ہی تمام سامان راستے سے ہٹالے گی آفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"ماں جی! کوئی بات نہیں۔ جب فوجی گاڑیوں کے گزرنے کا وقت آئے گا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔ ابھی آپ اطمینان سے دکانداری کریں۔"

"آفیسر تم کتنے اچھے ہو۔ کتنے مہربان ہو۔ آؤ میری دکان سے کوئی چیز پسند کرو۔"

اس نے دور بانو کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بیشک پسند کروں گا لیکن قیمت ادا کروں گا۔ میں رشوت پسند نہیں کرتا کیوں کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔"

بوڑھی عورت نے حیرانی سے پوچھا۔

"او آفیسر! کیا تم مسلمان ہو؟"

"الحمدللہ۔ لیکن آپ کو حیرانی کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ تم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہو۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "تو کیا ہوا۔ بھارتی سینا میں مسلمان سپاہی بھی ہوتے ہیں۔ یہ دیس ہم سب کا ہے۔"

وہ مسکراتا ہوا دکان کے شوکیس کے پاس آگیا۔ بانو ایک گاہک سے نمٹ رہی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے کیپٹن سے پوچھا "فرمائیے"

اس نے دکان کے باہر بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ ایک روپے میں کوئی بھی چیز خریدی جا سکتی ہے۔" اس نے بانو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کوئی بھی چیز؟"

"جی ہاں۔ کوئی بھی ..." وہ کہتے کہتے چونک گئی۔ کیپٹن اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

بانو کو میٹھا میٹھا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کی امی اسے نصیحتیں کرتی رہتی تھیں کہ وہ مردوں کی بے تکلفی اور لچھے دار باتوں سے خود کو بچا کر رکھے۔ ایک بار وہ فریب کھا چکی ہے اب اسی فریب کے آئینہ میں اجنبی مردوں کا چہرہ دیکھنا چاہئے۔ لہٰذا بانو نے اس ایک روپیہ کو قبول کرنے کے بجائے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ یہ تو بتائیں خریدنا کیا چاہتے ہیں؟"

"سب سے حسین چیز.... اگرچہ یہ انمول ہے دنیا کے سارے دولت مند اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک روپیہ تو میں اس دکان کے اصول کے مطابق دے رہا ہوں۔"

بانو کا دھڑکتا ہوا دل کہنے لگا "واقعی یہ مرد لچھے دار باتیں کرتے ہیں۔ ایک بات کے پیچھے اپنے مطلب کی دوسری بات کہہ جاتے ہیں۔ آفیسر کی اس بے باکی پر مجھے غصہ کا

انتظار کرنا چاہیے۔ مگر میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟
اس نے ایک دم سے گھبرا کر ماں کو آواز دی۔ ماں تیزی سے چلتی ہوئی آئی "کیا بات ہے بانو؟"

بانو کے بولنے سے پہلے کیپٹن نے کہا۔

"میں آپ کی بیٹی کو پریشان کر رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔"

بانو اس کی بے باکی پر گھبرا گئی تھی۔ ماں نے محبت سے پچکارتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم پریشان کیوں ہو گئیں؟ آفیسر جو مانگ رہے ہیں وہ دے دو۔"

"مم۔ مگر امی مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ پوچھ لیں یہ کیا چاہتے ہیں؟"

وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر دکان کے دور افتادہ حصہ میں چلی گئی پھر خود کو دوسرے کاموں میں لگا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مگر کان اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے وہ کہہ رہا تھا۔

"ماں جی! کیا میں آپ کو امی کہہ سکتا ہوں؟"

ماں کی باچھیں کھل گئیں۔ "ضرور میرے سپاہی بیٹے! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"میرا کوئی نہیں ہے میں اتنی بڑی دنیا میں بالکل۔ تنہا۔۔۔"

اتنا کہتے کہتے اس کا لہجہ شیشۂ دل کی طرح تڑخ گیا۔ ماں کے دل سے آہ نکلی۔

بانو کے دل نے کہا "بیچارہ۔"

پہلے پہل درد کے رشتے اسی طرح ہمدرد بنتے ہیں پہلے کسی اجنبی دل کے خلا میں جھانک کر دیکھا جاتا ہے پھر محبت اس دل کے خالی کیسٹ میں اپنی آواز ریکارڈ کرتی ہے

ایسا سوچتے ہی بانو چونک گئی۔ "ہائے اللہ! میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کوئی اس دنیا میں تنہا ہے، توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے تو ہوا کرے میرے دل نے جو زخم کھائے ہیں ان کے لیے اب میرے پاس آنسوؤں کا مرہم بھی نہیں ہے میں روتے روتے تھک گئی ہوں۔ اب میں کوئی نیا روگ نہیں لگاؤں گی۔ اب اس کی باتیں نہیں سنوں گی۔"

وہ نگاہیں چرا سکتی تھی۔ منہ پھیر سکتی تھی مگر اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

"امی! آپ کی صورت ہوبہو میری امی جیسی ہے بالکل ویسا ہی ممتا کا نور ہے آپ کو دیکھتے ہی بے اختیار امی کہنے کو جی چاہنے لگا۔"

ماں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا "آج سے میں تمہاری امی ہوں۔ دکان کے اندر آؤ۔ میں تمہیں دودھ پتی کی چائے پلاؤں گی۔"

وہ دکان کے اندر تو گیا، دل کے اندر جا کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بانو کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں شام کو فرصت ملے گی۔ میں آپ کو بتا دوں کہ آج میری پیدائش کا دن ہے میں مایوس تھا کہ تنہا کس طرح سالگرہ مناؤں لیکن اب آپ کی ممتا نے تنہائی کا دکھ سمیٹ لیا ہے میں آپ کو اور آپ کی صاحبزادی کو۔ میرا مطلب ہے آپکے گھر والوں کو ڈنر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آج رات آپ میرے ساتھ لنگرزی ہوٹل چلیں گی؟"

"نہیں بیٹے۔ یہ تکلف نہ کرو۔ میں تمہیں فضول خرچی کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"آپ بڑی خوبصورتی سے میری دعوت کو ٹھکرا رہی ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ماں اپنے بچوں کا دل کبھی نہیں توڑتی۔ میں اپنے گھر میں سالگرہ کا اہتمام کروں گی شام کو چھٹی ہوتے ہی یہاں چلے آنا۔ میرا گھر یہاں سے دور نہیں ہے۔"

"او امی! یو آر گریٹ! تین برس کے بعد میں ایک گھر میں باقاعدہ سالگرہ مناؤں گا۔ یہ خوشیاں مجھے آپ ہی کے دم سے مل رہی ہیں۔"

بانو نے ذرا سر گھما کر اُسے دیکھا۔ اتنے بڑے آفیسر کے چہرے پر بچوں جیسی خوشیاں دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ کیپٹن نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ فوراً ہی سر گھما کر بے کام کے کام میں مصروف ہو گئی۔

کیپٹن کے دل نے کہا ”وہ مارا“

بانو کے دل نے کہا ”ہائے میں مر گئی۔ کہیں وہ میری مسکراہٹ کا مطلب غلط نہ سمجھ بیٹھے۔ پھر کیا ہوگا؟“

وہ واپس جا رہا تھا۔ ماں نے پوچھا ”بیٹے تم کوئی چیز خریدنے والے تھے خالی ہاتھ کیوں جا رہے ہو“

اس نے پلٹ کر بانو کو دیکھا، پھر ماں کو دیکھ کر کہا۔

”میں نے یہاں سے انمول چیز خریدی ہے اور وہ ہے محبت ...“

بانو کا دل دھک سے رہ گیا جیسے محبت کے ایک لفظ نے دھکا مارا ہو۔ جوانی کی شاہراہ پر جذبوں کا آتا جاتا ہجوم ہو تو کہیں نہ کہیں سے ضرور دھکا لگتا ہے اور دھکا مارنے والے بڑی لاپرواہی سے گزر جاتے ہیں۔ بانو نے ذرا سنبھل کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

اس کی ماں بظاہر چپ چاپ کھڑی اوجھل ہونے والے سپاہی بیٹے کو دیکھ رہی تھی لیکن اس کی نظریں دائیں طرف ایک آئینہ پر بھی تھیں جس میں بانو دکھائی دے رہی تھی وہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی بیٹی کو الجھتے دیکھ کر ماں کے احساسات دکھنے لگے۔ جوانی کی ایسی کڑی دھوپ میں لڑکیاں محبت کی چھاؤں تلاش کرتی ہیں اور بانو محبت کی چھاؤں میں جل گئی تھی۔ ماں فکرمند ہو گئی کہ اب کیا ہوگا۔ بیٹی پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزارے گی؟ کیا ہمیشہ شادی کے خیال سے سہم جایا کرے گی؟

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکی۔ آتے جاتے ہوئے گاہکوں نے اس کا دھیان بیٹی کی طرف سے ہٹا دیا۔ شام ہوتے ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکانیں بند ہو جاتی تھیں اس لئے ماں بیٹی بھی دکان بڑھانے لگیں۔ ماں نے کہا۔

”وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں بھی عجیب ہوں۔ اسے بیٹا بنایا مگر اس کا نام پوچھنا بھول گئی۔ تم نے پوچھا تھا بانو؟“

”آں، نہیں تو، میں بھلا کیوں کسی کا نام پوچھوں؟“

”ایسا نہ کہو بیٹی۔ سب ہی مرد آصف کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ لڑکا اچھا ہے۔ پھر بالکل اکیلا ہے۔ اسے ہماری محبت ملے گی تو یہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔“

”امی ہم دکاندار ہیں۔ یہاں گاہک جانے کے لئے آتے ہیں اور وہ آ کر جا چکا ہے اب آپ دکان بڑھائیں۔“

”نہیں بانو! میں کچھ دیر اس کا انتظار کروں گی تم گھر جا کر سالن اور بریانی تیار کرو۔ میں برتھ ڈے کیک لے آؤں گی۔“

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہوئی ذہن سے باہر نکل آئی باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”امی کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے بھی رعایتی شرح پر کسی کے ساتھ چلتا کر دیتیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے دو گھڑی کی جان پہچان میں دعوت کا انتظام کر رہی ہیں اس کی سالگرہ منانے والی ہیں۔“

ماں پچھلے دو برس سے کسی بھی خوبرو اور کماؤ پوت شریف زادے کو ایسی نظروں سے دیکھتی آ رہی تھی جیسے وہ اس کی بانو کے لئے پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان لڑکے کہاں رہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب پاکستان چلے گئے ہیں۔ کسی نے نہیں سوچا کہ بانو جوان ہو گی تو اس کا کیا بنے گا؟ اسی لئے جب کوئی مسلمان لڑکا جھروکے سے نظر آ جاتا تو ماں اس پر واری صدقے ہونے لگتی تھی۔

بانو راستے کے کنارے ٹھٹھک گئی۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سپاہی جانتا ہے کہ مورچہ کہاں بنانا چاہیئے۔ اس نے بانو کو شرماتے گھبراتے دیکھ کر کہا۔

”تمہاری سہمی ہوئی۔ جھجکی ہوئی اور شرماتی ہوئی ادائیں بتا رہی ہیں کہ تم کنواری اور اچھوتی ہو۔ اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہارا راستہ نہیں روکا ہے۔“

بانو کو یوں لگا جیسے سپاہی اپنی بندوق کی گولی سے اس کے سینے کو داغ رہا ہے

وہ جلدی سے بولی۔

"امی نے آپ کے انتظار میں دکان ابھی تک بند نہیں کی۔ آپ کو فوراً وہاں جانا چاہیئے"

"میں جان بوجھ کر دکان کی طرف نہیں گیا۔ میں نے سوچا دعوت کے سلسلے میں کچھ پکانے کیلئے تمہاری امی گھر جائیں گی تو دکان میں اگر تم سے دل کی بات کہوں گا مگر وہ دکان میں رہ گئیں اور تم شاید گھر جا رہی ہو چلو یوں بھی کام بن رہا ہے۔ تم ناراض تو نہیں ہو"

وہ ناراض کیوں ہوتی؟ اسے تو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا وہ راستے کنارے یوں انتظار کر رہا تھا جیسے اپنی تقدیر کا راستہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے اپنی وردی پر اسے تمغے کی طرح سجا نا چاہتا ہو۔ ایسے میں کوئی لڑکی ناراض نہیں ہوتی۔ صرف رسماً اعتراض کرتی ہے

"آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں"

"میں نے آج تک کسی لڑکی سے دل کی بات نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے کہنا چاہئے؟ کس طرح ابتداء کرنی چاہیئے۔ عام سا طریقہ یہ ہے کہ اجنبیت دور کرنے کے لئے پہلے اپنا تعارف کرایا جاتا ہے تمہارا نام تو مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ ایران میں کنواری لڑکیوں کو بانو کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے"

پھر وہی کنوارپن کی بات اس نے کہہ دی۔ بانو نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔ تاکہ اس سے آگے نکل جائے۔

"بھئی اتنی تیزی سے نہ چلو۔ کیا مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حق نہیں دو گی؟ کم از کم میرا نام تو پوچھ لو کبھی کام آئے گا"

"امی آپ کا نام پوچھنا بھول گئی تھیں۔ آپ انہیں بتا دیں"

"میں انہیں بتا دوں گا۔ پھر وہ تمہیں بتائیں گی"۔ پھر تم اپنے دل کو بتاؤ گی پھر تمہارا دل اپنی دھڑکنوں کو بتائے گا۔ کسی کا نام بتانے کچہری میں بھی آنا نہیں گھومتا جتنا

تم گھمانا چاہتی ہو"

بانو کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ اپنی سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکی۔ اپنے ہنستے کھلکھلاتے ہونٹوں کو ہتھیلی کی آڑ میں چھپا کر بولی۔

"آپ بہت زیادہ بولتے ہیں"

"ابتدائی مرحلے پر لڑکیاں شرماتی ہیں۔ اس لئے خود بولنا چاہیئے اس کے بعد وہ بولنے کا موقع نہیں دیتیں"

"آپ کو لڑکیوں کی دوستی کا خاصا تجربہ ہے"

"ہاں میں نے دو بار قسمت آزمائی کی مگر قسمت میرے صبر کو آزماتی رہی۔ پہلی بار میں نے محبت کی مگر وہ میری ہم مزاج نہیں تھی۔ اس لئے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار لڑکی میرے معیار کے مطابق تھی مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا" اس نے بانو کو دیکھتے ہوئے کہا "پتہ نہیں تیسری بار کیا ہوگا"

بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "بار بار دھوکہ کھانے سے بہتر ہے کہ کسی سے خالص محبت کی توقع نہ کی جائے"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" کیپٹن نے کہا "ہم ٹریفک کے ہجوم سے گزرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ کبھی نہ کبھی حادثہ پیش آئے گا ہم راستوں پر چلنا چھوڑ تو نہیں دیتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محبت کا فریب دیتا ہے پھر بھی ہم کسی نہ کسی سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ نہ ہو تو دنیا میں گولے بارود اور فوجی وردی کے سوا کچھ نہ رہے"

بانو کے دل نے تائید کی "ہاں محبت کے بغیر ہر خوشی کھوکھلی سی لگتی ہے کسی کو پیار سے کچھ دیئے اور کچھ لئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اسی لئے محبت ہماری زندگی میں موت کی طرح اٹل ہے ضرور آتی ہے اور بڑی خوبصورتی سے مارتی رہتی ہے"

وہ محبت کے مارے اندر ہی اندر مرنے لگی۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ آفیسر کچھ اور بولے۔ کم از کم اپنا نام ہی بتادے۔ نام نہیں بتائے گا تو پھر کس نام سے خیالوں میں آئے گا؟

"آپ باتیں کرتے کرتے کتنی دور آگئے ہیں آپ کو امی کے پاس جانا چاہیئے۔"

"چلا جاؤں گا اور انہیں اپنا نام بھی بتا دوں گا کہ میرا نام سرتاج حسین ہے مگر تم چاہو تو سرتاج کہہ سکتی ہو۔"

"سرتاج۔ یہ لفظ تو بڑا ہی محبت پرور اور پائیدار ہوتا ہے عورت کا محافظ ہوتا ہے اس کی عزت و آبرو اور مستقبل کا ضامن ہوتا ہے مگر یہ لفظ پان کی پیک کی طرح بانو کے منہ پر پڑا اور دل کے لہو میں گھل گیا۔ اسے آصف یاد آیا جو سرتاج بن کر آیا تھا اور سر کی چادر نوچ کر لے گیا تھا۔ وہ کیپٹن سرتاج حسین سے دور بھاگتی چلی گئی۔ اچھا ہوا کہ گھر سامنے آگیا تھا۔ وہ مکان میں گھستے ہی دروازہ بند کر کے دیکھنے والے کی نظروں سے چھپ گئی۔

سرتاج حسین دور کھڑا تھوڑی دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا اور یہ سوچ کر مسکراتا رہا کہ اس نے اپنے نام سے فائدہ اٹھا کر سرتاج والی بات خوب کہی ہے شادی اور سرتاج کے ذکر پر کون کنواری نہیں شرماتی۔ اسی لئے وہ شرما کر بھاگ گئی۔ انسان کبھی کبھی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا رہتا ہے وہ مسکراتا ہوا دکان کی طرف واپس چلا گیا۔

بانو دروازے کے پیچھے کھڑی ایسے مرد کے خیال سے کانپتی رہی جو شوہر بن کر آتا ہے اور سہاگ کے نام پر سب کچھ لوٹ کر چلا جاتا ہے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ سر چکرا رہا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چولہے کے پاس کبھی نہ جاتی۔ بستر پر جا کر گر پڑتی اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی لیکن ماں نے آج رات پھر ایک مہمان کے لئے دسترخوان بچھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ شرافت کے دائرے میں ۔۔۔۔۔ جوان بیٹیوں کو اسی طرح نگاہوں کے سامنے بچھایا جاتا ہے وہ ماں کے سر سے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے باورچی خانے میں یوں جانے لگی۔

جیسے خود کو چولہے میں جھونکنے جا رہی ہو۔

*

گمشدہ طیارے کے پائلٹ سے رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ کنٹرول ٹاور کے ریڈیو آپریٹر نے آخری بار اسے کال کیا۔ پھر مایوس ہو کر اس نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور ٹریفک کنٹرول سینٹر کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

"ہیلو، میں کنٹرول ٹاور سے ریڈیو آپریٹر بول رہا ہوں۔ فلائنگ کلب کے ایک چارٹرڈ کئے ہوئے طیارے ایف سی ون۔ ٹو۔ او۔ ٹو کا پائلٹ خاموش ہے بار بار کال کرنے کے باوجود جواب نہیں مل رہا ہے اس طیارے کو فوراً تلاش کیا جائے۔"

دوسری طرف سے کنٹرول سینٹر کے کپتان نے پوچھا۔

"اس طیارے سے آخری بار کب رابطہ ہوا تھا؟"

"صبح ساڑھے نو بجے اس وقت وہ شمال کی طرف یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی ایک پارٹی اسے تلاش کرنے کیلئے روانہ کی جائے گی۔"

اس گفتگو کے بیس منٹ بعد ایک طیارہ شمال کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ وہاں سے فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ جلد ہی ایئر سرچ پٹرول کے پائلٹ نے اس سیاہ عمودی چٹان کی ٹوٹی ہوئی انگلی دیکھ لی۔ پھر طیارے میں بیٹھنے والے سارجنٹ کو اطلاع دی۔

"ہم جائے حادثہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیمرے تیار رکھے جائیں۔ میں عمودی چٹان کے اطراف دو چکر لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے دو راؤنڈ کافی ہوں گے۔"

سارجنٹ کا جواب ملتے ہی پائلٹ ایک دائرہ کی صورت میں طیارے کو موڑنے لگا کیپٹن آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھنے لگا۔ چٹان کی وسیع آغوش میں ایک ٹوٹا اور بکھرا ہوا طیارہ نظر آ رہا تھا کیپٹن نے دوربین سے نظریں ہٹا کر دوسری کھڑکی کی جانب دیکھا وہاں سارجنٹ کیمرے پر جھکا ہوا تصویریں اتارنے میں مصروف تھا وہ سوچنے لگا

کر آہنی طیارے کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ کیا انسانی جسم سلامت ہوں گے؟

اس کا جواب تصویروں سے مل سکتا تھا۔ پینتالیس منٹ کی پرواز کے بعد جب وہ کنٹرول سینٹر میں واپس آئے تو سارجنٹ فوراً ہی تصویروں کو ڈیولپ اور انلارج کرنے ڈارک روم میں چلا گیا۔ کیپٹن بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ بے چینی اس قدر تھی کہ بار بار سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ ایک وقت آتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جاتی ہیں لہٰذا وہ گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ سارجنٹ ڈارک روم سے باہر آیا۔ پھر اس نے گیلی تصویریں سامنے میز پر پھیلا دیں۔

کیپٹن محدب شیشہ اٹھا کر باری باری ان تصویروں کو دیکھنے لگا جہاز کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان انسانی جسم گڈے گڑیوں کی طرح اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک مرد تھا، ایک عورت تھی اور مرد کے قدموں کے پاس ایک بچہ نظر آرہا تھا۔ طویل فاصلے سے کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بچہ ہے یا بچی؟ وہ جو بھی ہو کیپٹن اُسے دیر تک نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اتنا بڑا اس کا اپنا بچہ بھی تھا تصویر کو دیکھتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا "سب کے سب مر چکے ہیں"

اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ پھر کسی سے کہنے لگا۔

"بہت ہی المناک حادثہ ہوا ہے ایسے حادثہ میں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا تھا اب ان لاشوں کو وہاں سے لانے کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ عمودی چٹان بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے"

وہ فون پر گفتگو کر رہا تھا اور سارجنٹ محدب شیشہ کے آر پار ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ یکبارگی وہ چونک کر اچھل پڑا اور چیخ کر بولا۔

"سر! اسے دیکھئے۔ یہ۔ یہ۔ اس تصویر کو دیکھئے۔ بچہ زندہ ہے"

کیپٹن کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔ اس نے بھی جواباً حیرت سے چیخ کر پوچھا۔

"کیا واقعی بچہ زندہ ہے؟"

*

چولہے کی آنچ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف سالن پک رہا تھا۔ دوسری طرف بانو پک رہی تھی۔ اس کے دماغ کے چولہے پر آصف کی یادیں ابل رہی تھیں۔ ایسا تو ہوتا ہے کہ ایک دل سے جاتا ہے تو دوسرا اس خالی دل کے آنگن میں آجاتا ہے۔ آج سراج حسین آرہا تھا۔ کچھ اسی طرح آصف بھی آیا تھا بلکہ وہ عشق و محبت کے مراحل سے گذر کر نہیں بلکہ سیدھے سادے انداز میں دولہا بن کر اس کے گھونگھٹ تک پہنچ گیا تھا۔

بانو نے گھونگھٹ کے پیچھے سے پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔

"دیکھو بیٹی! مرد کی صورت شکل نہیں دیکھی جاتی۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہے وہ پرائی نظروں سے بچا کر رکھتا ہو۔ وہ جیسا بھی ہو، آخر مجازی خدا ہوتا ہے"

ماں نے آصف کو بیٹی کے لئے پسند کیا تھا اس لئے شادی سے پہلے صفائی پیش کر دی تھی، کہ آصف بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے اور بدصورت بھی نہیں ہے وہاں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتہ نہیں کب ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں اور ہندو غنڈے بانو کو اٹھا کر لے جائیں۔ ماں چھاتی پیٹتی رہ جائے گی کوئی عزت بچانے والا نہ ہوگا اگر اس کی شادی ہو جائے تو گھر میں ایک مرد آجائے گا۔ اس بات کا اطمینان رہے گا کہ غنڈے بے باکی سے حملہ نہیں کریں گے۔

حالات ایسے تھے کہ بانو کسی آئیڈیل کا تصور نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے کیلئے سال دو سال جوانی کی دہلیز پر بیٹھی رہ سکتی تھی۔ آئے دن یہ خبریں سننے میں آتی تھیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے۔ ان کے شہروں میں آگ اور خون کا یہ کھیل کسی بھی وقت کھیلا جاسکتا تھا اسی گھبراہٹ اور افراتفری میں وہ دلہن بن کر آصف کی پناہ میں آگئی۔

آصف ایک دُبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ صورت اچھی تھی نہ بُری کوئی بھی جوان لڑکی اُسے محبوب کے روپ میں نہیں، صرف شوہر کے روپ میں قبول کر سکتی تھی۔ بانو نے بھی اسے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک وہ گھر میں پڑا رہا۔ تین وقت کھاتا تھا پھر ڈکاریں لیتا ہوا باہر تفریح کے لئے نکل جاتا، اور رات کو واپس آ کر محبت کے فرائض ادا کرتا تھا۔ ایک دن بانو کی ماں نے ٹوک دیا۔

"بیٹا! مرد محنت کرتے اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام کرنا چاہیئے۔"

"ماں جی! اس دیس میں مسلمانوں کو کام کہاں ملتا ہے یہاں کی بھوکی جنتا میں ہم جیسوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

"ایسا نہ کہو بیٹے! یہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح سے زندگی گذار رہے ہیں۔"

"پتہ نہیں کس طرح گذار رہے ہیں مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا۔ اسی لئے آپ کا داماد بن کر یہاں آ گیا۔ آپ کی دکان اچھی چل رہی ہے۔ اللہ دے رہا ہے تو مجھ جیسے ایک بندے کو بٹھا کر کھلانے میں کیا نقصان ہے؟"

اُس کی باتیں سن کر بانو کو بہت غصہ آیا۔ اس کی ماں اپنے داماد سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اُن پر بوجھ بنا ہوا ہے مگر ایک بیوی اپنے شوہر سے کہہ سکتی تھی۔ ماں کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

"آپ مرد ہیں۔ آپ کو اپنی محنت مزدوری سے میرے اخراجات پورے کرنے چاہئیں کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ آپ امی کی دکان پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔"

"تم مجھے شرم نہ دلاؤ۔ شرم تمہیں آنی چاہیئے۔ بتاؤ میرے لئے جہیز میں کیا لائی ہو؟ میں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ اب بات نکلی ہے تو بولنا پڑتا ہے تمہاری ماں بوڑھی ہو چکی ہے آج یا کل اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔ پھر اُن کی دکان تمہاری ہو گی اور تمہاری ہر چیز میری ہی ہوتی ہے۔"

وہ حیرانی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتی رہ گئی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ جیسا اُس نے کبھی سوچا نہ تھا ویسا اس کا شوہر تھا۔ دکان کو اپنی بیوی کا جہیز سمجھ رہا تھا اور اس کی امی کے مرنے کا خواب دیکھ رہا تھا وہ صرف تین وقت کھانا اور اس کے ساتھ سونا جانتا تھا تیسرا کوئی کام اسے نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔

"آپ میری امی کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ کو موت آ جائے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ ایسے ناکارہ، کام چور اور مطلب پرست ہیں تو میں کبھی شادی نہ کرتی دور ہو جائیے میری نظروں سے۔"

وہ مزید بحث کئے بغیر اطمینان سے گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بانو کے سر سے آنچل گر گیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا آخر اپنے سہاگ سے کچھ تو لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے آنچل پھٹا پرانا ہی کیوں نہ ہو۔ سر کو ڈھانپ تو دیتا ہے دنیا والے اسے سر سے ننگی تو نہیں کہہ سکتے۔ غصہ میں وہ بھول گئی تھی کہ مجازی خدا خواہ کیسا ہی ہو اس کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیئے۔ اب وہ چلا گیا تو غصہ دھیما پڑ گیا اور غلطی کا احساس ستانے لگا۔ ماں رات کو دکان بند کر کے آئی تو اُس نے تسلی دی۔

"بیٹی گھبراؤ نہیں وہ آ جائے گا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ محنت سے چار پیسے کما سکتا ہے یہاں مفت کی روٹیاں ملتی ہیں۔ اس لئے وہ ضرور آئے گا۔"

مگر وہ رات کو نہیں آیا۔ صبح بانو ...... دکان کھولنے جایا کرتی تھی اس روز نہ جا سکی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ ماں اس کی پریشانیوں کو سمجھ کر خود ہی دکان داری کے لئے چلی گئی۔ دوپہر کو جب وہ روٹیاں پکا رہی تھی تو وہ بھوکا پیاسا آ کر باورچی خانہ میں بیٹھ گیا۔ اُسے دیکھ کر بانو کو یوں لگا جیسے وہ اپنا کوئی نہیں ہے مگر گھر کا ایک سامان ہے جو گم ہونے کے بعد مل گیا ہے اُسے خوشی ہوئی لیکن غصہ دکھانا بھی ضروری تھا اس نے غصے سے روٹیوں کا چھابہ اس کے آگے پٹخ دیا۔ ہانڈی سے سالن نکال کر دیا۔ اس طرح غصہ

بھی دکھایا اور اس کی خاطر تواضع بھی کی۔ پھر طنز بھی کیا۔

"جس کے ساتھ رات گذار کر آئے ہو کیا اس نے روٹی نہیں کھلائی"

اس نے ایک لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

"میں نے رات اسٹیشن کی سرائے میں گذاری ہے کل سے کچھ نہیں کھایا بھوکا پیاسا تمہیں یاد کرتا رہا"

بانو کا دل بھر آیا۔ بیچارہ کل سے بھوکا تھا وہ محبت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو مگر بھوک پیاس کے وقت مجھے یاد کرتا ہے کسی نہ کسی طرح میرا محتاج ہے بیچارہ دو وقت کھا لیا کرے گا، تو کون سا بوجھ بن جائے گا کم از کم نام تو ہوگا کہ اس گھر میں ایک مرد بھی رہتا ہے"

یہ سوچ کر وہ محبت سے سمجھانے لگی "آپ کہیں ملازمت کے لئے پریشان نہ ہوں۔ میں صبح سے دوپہر تک دکان میں بیٹھتی ہوں میری جگہ آپ دکان سنبھالا کریں۔ امی خوش ہو جائیں گی کہ آپ کو ذمہ داری کا احساس ہو گیا ہے۔"

آصف راضی ہو گیا۔ بانو تین دن تک اس کے ساتھ دکان پر جاتی رہی۔ اسے تمام چیزوں کی قیمت اور گاہکوں سے نمٹنے کے گر سکھاتی رہی۔ جتنا اس نے سکھایا، آصف نے اس سے کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا۔ آئے دن موقع پا کر گلے سے روپے چرانے لگا۔ بانو کی ماں گلے کا وزن خوب سمجھتی تھی اس نے سمجھ لیا کہ دکان کی آمدنی میں کچھ ہیرا پھیری ہو رہی ہے مگر ساس اور داماد کے رشتہ کی لاج بھی رکھنی تھی اس لئے اس نے روزانہ دو چار روپے کی چوری برداشت کرلی۔ بانو کو بھی سمجھا دیا کہ آصف کو شرمندہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ وہ گلے میں سے اپنا جیب خرچ نکال لیا کرتا ہے۔

ماں بیٹی بڑی مصلحت سے کام لے رہی تھیں مگر چور کا حوصلہ بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ وہ نشہ کیا کرتا تھا۔ کنگال ہونے کے بعد نشہ چھوٹ گیا۔ اب پھر جیب میں خاصی رقم رہنے لگی تو اس نے دارو پینا شروع کر دی۔ اس پر ماں بیٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ایک رات بانو نے اُسے خوب سنائیں۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ شراب پی کر گھر آتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شرابی اور جواری ہو۔ نکمے اور بے غیرت ہو تمہاری بیوی بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ میں بیوہ بن کر رہوں اگر تمہیں موت نہیں آتی ہے تو کہیں جا کر ڈوب مرو۔ مرنے کا حوصلہ نہیں ہے تو صبح ہونے سے پہلے اس گھر سے چلے جاؤ"

وہ مدہوشی کی حالت میں بیوی کی کھری کھری باتیں سنتے سنتے سو گیا۔ آدھی رات کے بعد بانو بھی اپنی بدنصیبی کا دکھڑا روتے روتے سو گئی۔ صبح ماں کے چیخنے چلانے سے اس کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"آصف کہاں ہے؟"

بانو کو اس کا بستر خالی نظر آیا۔ ماں نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے دکان کا نیا اسٹاک خریدنے کے لئے پانچ ہزار روپے رکھے تھے۔ وہ روپے نہیں ہیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو دیکھو"

بانو الماری کے پاس گئی تو وہ کھلی ہوئی تھی جس دراز میں اس کے زیورات رکھے ہوئے تھے اب وہاں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نظر آ رہا تھا اس نے اسے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"بانو بیگم! اب تم میری بیوی نہیں ہو تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے کی بیوی بننے کے بجائے بیوہ بن کر رہنا چاہتی ہو۔ مجھ میں مرنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لئے باہوش وحواس تمہیں طلاق دیکر جا رہا ہوں۔

میری تلاش فضول ہے۔ فقط آصف"

طلاق نامہ پڑھتے ہی بانو چکرا کر گرنے لگی۔ ماں نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھال کر بستر پر لٹا دیا۔ پھر وہاں سے بھاگی بھاگی محلے کی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹی پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے پچھلی رات تک وہ سہاگن تھی اور اب اس کا سہاگ اجڑ گیا ہے اجاڑنے والا گھر سے نقدی اور زیورات بھی سمیٹ کر لے گیا ہے

اس نے لیڈی ڈاکٹر کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پچھلے دو دنوں سے بانو علیل تھی آج بستر سے اٹھتے ہی چکرا کر گر پڑی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی۔ پھر اسے اِدھر اُدھر ٹٹول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے ماں جی! تمہاری بیٹی ماں بننے والی ہے"

ماں چند لمحوں تک گم صم کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خبر سن کر اسے خوش ہونا چاہیئے یا اپنا سر پیٹنا چاہیے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ بیٹی ماں بننے والی تھی افسوس کا مقام تھا کہ وہ ایک چور کی اولاد کو جنم دے گی۔

بانو کو ہوش آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر اسے بھی خوشخبری سنا کر چلی گئی۔ وہ طلاق کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی خزاں میں پھول نہیں کھلتے۔ اگر کھلتے بھی ہوں تو خوشبو سے خالی ہوتے ہوں گے بانو بھی ایسے وقت ماں کی ممتا سے اور بچے کی خوشبو سے خالی رہی یہ بعد کی بات ہو گی کہ کبھی ممتا جوش میں آئے گی، ابھی تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کوکھ میں بچہ نہیں بلکہ بھاگنے والے چور کے نقش قدم ہیں۔

اس روز ماں بیٹی نے دکان نہیں کھولی۔ گھر میں تمام دن چپ چپ سی رہیں۔ بانو مطلقہ عورت بن کر بڑی توہین محسوس کر رہی تھی۔ یہ خیال اسے مار رہا تھا کہ پاس پڑوس کی سہاگنیں اب اسے اپنے پاس نہیں بٹھائیں گی۔ کیونکہ وہ سہاگ کی دہلیز کے باہر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس کی قابل فخر سماجی حیثیت نہیں تھی ایسا سوچتے وقت وہ خود کو ایک خوبصورت بچے کے تصور سے بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ اس دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اپنے جگر کا ٹکڑا ہی اپنا ہوتا ہے وہ اپنے بچے کے سہارے زندگی گزارے گی۔

دوسری طرف ماں سوچ رہی تھی کہ بانو اپنی پہاڑ سی جوانی کیسے گذارے گی؟ صرف بڑھاپا ایسا ہے جو اولاد کے سہارے گزرتا ہے ورنہ جوانی کسی جوانی کا ہاتھ تھامے بغیر آگے بڑھے تو کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتی ہے۔

لہٰذا اس بچے کو پیدا نہیں ہونا چاہیئے اگر پیدا ہو جائے تو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک تو یہاں مسلمان لڑکوں کا قحط پڑا ہوا ہے اگر کوئی بانو کے حسن سے متاثر ہو کر آئے گا تو اسے بچے والی دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ بانو تو آئندہ بھی ماں بن سکتی ہے لیکن گود میں ایک بچہ رکھ کر سہاگن نہیں بن سکتی۔

ماں نے دل پر جبر کرتے ہوئے اور دونوں مٹھیاں سختی سے بھینچتے ہوئے فیصلہ کیا۔

"وہ بچہ زندہ نہیں رہے گا"

❦

"ہاں وہ بچہ زندہ ہے"

میز پر گیلی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ سارجنٹ نے دو عدد تصویریں اٹھا کر کیپٹن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ان تصویروں کو ذرا غور سے دیکھیں"

کیپٹن محدب شیشہ ہاتھ میں لے کر توجہ سے دیکھنے لگا۔ سارجنٹ کی آواز اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔

"ہمارے طیارے نے عمودی چٹان کے دو چکر لگائے تھے۔ یہ تصویر پہلے راؤنڈ میں اتاری گئی تھی۔ اس تصویر میں بچہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ دوسرے راؤنڈ میں یہ تصویر اتاری گئی تھی اس میں بچے کے ہاتھ پاؤں ذرا اٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں وہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا ہے"

کیپٹن کے جس ہاتھ میں تصویر تھی وہ ہاتھ کانپنے لگا۔ بچہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا یعنی اپنی زندگی کے لئے لڑ رہا تھا کیپٹن کا دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ اس کا اپنا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے سگنل دے رہا ہے "پاپا آؤ۔ مجھے بچاؤ......"

وہ بچہ صرف کیپٹن کو نہیں۔ ابھی ساری انسانیت کو تڑپانے والا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

"میں کیپٹن ہری رام بول رہا ہوں۔ طیارے کو جہاں حادثہ پیش آیا ہے وہاں ایک بچہ زندہ ہے وہاں فوراً امدادی پارٹی روانہ کرو۔ مجھے بلاتاخیر یہ رپورٹ ملنی چاہیئے کہ اتنی بلندی سے کس طرح بحفاظت اتارا جاسکتا ہے"

یہ حکم دینے کے بعد کیپٹن نے فلائنگ کلب سے رابطہ قائم کیا۔

"میں کیپٹن ہری رام کنٹرول سینٹرل سے بول رہا ہوں۔ آپ فوراً تفصیل رپورٹ پیش کریں کہ کس شخص نے طیارہ ایف سی ون۔ ٹو اوٹو چارٹرڈ کیا تھا؟ طیارے میں کتنے افراد تھے؟ ان میں ایک بچہ بھی ہے اس کا تعلق کس سے ہے؟"

اس کے بعد وہ کسی تیسری جگہ نمبر ڈائل کرنے لگا مگر اب وہ تنہا پریشان نہیں تھا مختلف متعلقہ اداروں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹیلیفوں کی گھنٹیاں چیخ رہی تھیں ایک ایک فون کی چیخ و پکار کے پیچھے جو لوگ تھے ان کے دماغوں کی اسکرین پر صرف ایک معصوم بچہ تھا۔ جو دو لاشوں کے پاس پڑا ہوا زندگی کو پکار رہا تھا۔

*

آٹھ ماہ سے وہ بچہ بانو کے وجود میں چھپ کر کروٹیں بدل رہا تھا وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہی تھی۔

"میرا بچہ کیسا ہوگا؟ اپنے باپ کی طرح یا میری طرح؟"

ماں نے بارہا سمجھایا۔ "وہ جیسا بھی ہو اُسے اپنے دل سے نوچ کر پھینک دو تمہیں سمجھاتے سمجھاتے آٹھ ماہ گذر گئے۔ اگر تم پہلے ہی مان جاتیں تو وہ بچہ آسانی سے ضائع ہو جاتا۔ اب بھی وقت ہے بانو، اپنے آپ پر رحم کرو"

"امی کیا آپ ہوش و حواس میں نہیں ہیں؟ کیا آپ میرے بچے کی قاتل بنا چاہتی ہیں؟

"نہیں بیٹی! ہم دونوں کی بھلائی چاہتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم پہلے جیسی بن جاؤ۔ ہم یہ دکان فروخت کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے کوئی یہ نہ جان سکے گا کہ کبھی تم سہاگن بنی تھیں اور ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ کسی فلاحی ادارے میں پرورش پالے"

"نہیں امی! میں اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ میں اس معصوم سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتی"

"تم کبھی آصف سے بھی جدا ہونے کا تصور نہیں کرتی تھیں۔ مگر اب اس کے لئے صبر کرلیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ بچے کے لئے بھی صبر آجائے گا۔"

"آپ ضد کیوں کر رہی ہیں۔ میں اب شادی نہیں کروں گی بس دیکھ لی مرد کی دوستی۔ ایک نے مجھے داغ لگایا ہے۔ دوسرا کوئی آئے گا تو مجھے داغدار کہہ کر طعنہ دے گا۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں گھر سے چلی جاؤں گی"

ماں ڈر کر خاموش ہو گئی کہ کہیں بیٹی سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے وہ ممتا کو سمجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی سنوارنے کے لئے دن رات پریشان رہتی تھی اسی طرح بیٹی اپنی ممتا سے مجبور تھی اور خیال ہی خیال میں بچے کو جنم دیکر اسے سینے سے لگا کر چومتی رہتی تھی۔ یہ نہیں سوچتی تھی کہ ایک بچے کی وجہ سے اس کی جوانی غارت ہو جائے گی۔

جب وہ بانو کو سمجھا کر تھک گئی تو یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وقت کی کوئی ٹھوکر ہی اسے سمجھائے گی۔ یہ آجکل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں بزرگوں کے تجربات کو یکسر جھٹلا دیتے ہیں لیکن وقت بڑا سنگدل ہوتا ہے وہ ایک ہی جھٹکے میں ماں کو بھی سنگدل بنا سکھا دیتا ہے۔ ایک رات بانو دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی اور باہر قیامت کا شور برپا تھا بہت دور سے "ہر ہر مہادیو" کی آوازیں آرہی تھیں اور محلے والے جواباً "اللہ اکبر" کے نعرے لگا رہے تھے۔

پورے محلے میں وہی ایک گھر ایسا تھا جہاں کوئی مرد نہیں تھا۔ کوئی محافظ نہ تھا۔ ماں پریشانی کے عالم میں کبھی بانو کے پاس بیٹھ جاتی تھی کبھی بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکی کھول کر دیکھتی تھی۔ باہر جو انسان تھے وہ درندے بن گئے تھے۔ نہ عورتوں کی عزت کا پاس تھا نہ انسانی زندگی کی کوئی قیمت تھی۔ پانی کی طرح لہو بہایا جا رہا تھا۔

ماں کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو وہ درد سے تڑپتی اور کراہتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ پلنگ کا سہارا لیکر دیوار تک پہنچ گئی پھر اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھا تو حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایک وحشی درندہ ایک نوزائیدہ بچے کو فضا میں اچھال کر نیزے کی انی پر روک رہا تھا بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ایک دم سے چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

ماں اپنی بیٹی کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تو اب بانو تنہا نہیں تھی۔ اس کے قدموں کے پاس فرش پر ایک نوزائیدہ بچہ خون میں لتھڑا ہوا چیخ رہا تھا۔ باہر درندے لہو اچھال کر زندگی چھین رہے تھے اندر ایک ماں اپنے لہو کے چھینٹوں سے ایک ننھے انسان کو زندگی دے چکی تھی وہ مارے دہشت کے یہ بھول گئی تھی کہ دردِ زہ کیا ہوتا ہے اور وہ تخلیق کے کرب سے کیسے گزر گئی۔ اسے ایک ہی منظر یاد تھا کہ بچہ نیزے پر اچھالا جا رہا ہے وہ جنونی حالت میں چیخنے لگی۔

"امی۔ بچائیے۔ میرے بچے کو بچائیے۔ وہ ظالم اسے چھین کر لے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔"

اس کی ماں نے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر روتی ہوئی بولی۔

"بیٹی اب تو خدا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس دن کے لئے سمجھاتی تھی کہ اسے جنم نہ دو۔ مہذب درندوں کی اس دنیا میں ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ پھر اس بچے کو کہاں لے جا کر چھپائیں گے؟"

باہر ایک مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اس کے لپکتے ہوئے شعلوں کا عکس کھڑکی کے راستے بانو کے چہرے پر پڑ رہا تھا جیسے خود اس کا چہرہ جل رہا ہو۔ اس کا دل سلگ رہا ہو۔ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اسے کہیں بھی چھپا دیجئے۔ اسے لے کر یہاں سے بھاگ جائیے۔ میں صرف اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں بانو! تم اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہو اور میں تمہاری سلامتی کے لئے زندہ ہوں۔ اب یہ وقت آن پڑا ہے تو میری بات مان لو۔ میں اس بچے کو ایسی جگہ پہنچا دوں گی جہاں اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"کہاں؟" بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔ تم ابھی یہ نہ پوچھو۔ اپنے دل پر پتھر رکھ لو۔ تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی مگر یہ زندہ سلامت رہے گا۔"

"نن۔ نہیں۔۔ میں اپنے بچے۔۔۔۔۔"

اس کا انکار اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ کھڑکی کے قریب ایک کرخت آواز سنائی دی۔ پھر شعلوں کی روشنی میں ایک سکھ کا خونی چہرہ نظر آیا۔ اس کا گنڈاسا لہو سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ "ست سری اکال" کہتا ہوا کھڑکی کے راستے سے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ کسی نے اس کی پشت پر خنجر گھونپ دیا تھا وہ کھڑکی پر سے الٹ کر باہر گر پڑا۔ ماں نے دوڑ کر کھڑکی کو اندر سے بند کر دیا اور روتی ہوئی بولی۔

"بانو! تم خود غرض ہو۔ یہ ممتا نہیں بچے سے دشمنی ہے۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

"میں خود غرض نہیں ہوں۔ میں اپنے بچے کی دشمن نہیں ہوں۔ اسے لے جائیے ابھی لے جائیے میں اس کی جدائی برداشت کر لوں گی مگر یہ الزام نہیں اٹھا دوں گی کہ ماں کی

محبت ہی بچے کو مار ڈالتی ہے۔"

ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تاکہ اب بچے کی آواز بھی بانو کے کان میں نہ پڑے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ باہر کا ہنگامہ سرد پڑتے ہی وہ بچے کو یتیم خانہ میں چھوڑ آئے گی۔

بانو کمرے کے فرش پر تنہا پڑی ہوئی تھی۔ جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے آنسو بھری آنکھیں میچ لیں۔ پھر ایک طویل سانس اس طرح چھوڑی جیسے اندر سے بالکل خالی ہو جانا چاہتی ہو خالی تو وہ ہو گئی تھی۔ اب لٹنے کیلئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب کوئی چور، کوئی قاتل اس کے دروازے پر نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ ایک غریب مفلس کی طرح آرام سے سو سکتی تھی۔

دوسری صبح بستر پر اس کی آنکھ کھلی تو آس پاس کا ماحول ایسا خالی ایسا ننگا نظر آیا جیسے اتنی بڑی دنیا کے تن بدن سے آخری کپڑا بھی اتار لیا گیا ہو۔ ماں سامنے کھڑی تھی۔ اس کی جھکی جھکی سی نظریں کہہ رہی تھیں کہ اس نے ایک معصوم بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا ہے۔ بانو کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اُس نے پوچھا۔

"میرا لعل کہاں ہے؟ میرے بیٹا ہوا تھا نا؟"

"ہاں بالک آشرم میں....."

"بالک آشرم؟" بانو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آپ میرے بچے کو ہندوؤں کے آشرم میں کیوں چھوڑ آئی ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے امی؟"

"میں مجبور تھی بانو! مسلمانوں کی بستی ویران ہو رہی ہے۔ یتیم خانے میں گئی تو وہ خالی پڑا تھا۔ کچھ بچے مارے گئے۔ باقی بھاگ گئے۔ یتیم خانے کے کرتا دھرتا بھی نہیں تھے۔ میرے دل میں بات آئی کہ انسان انسان کا دشمن ہوتا ہے مگر مذہب مذہب کا دشمن نہیں ہوتا۔ کوئی دھرم نفرت اور دشمنی نہیں سکھاتا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جس دھرم کے چند لوگ

تمہارے بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں وہ بچہ فی الحال اسی دھرم کی پناہ میں محفوظ رہ سکتا ہے۔"

بانو چند لمحے تک ماں کو دیکھتی رہی۔ پھر روتی ہوئی بولی۔

"آپ نے بچے سے صرف اس کی ماں کو نہیں، اس کے ایمان کو بھی چھین لیا۔ کیا ایسا کرتے وقت آپ کے دل سے بھی ایمان نکل گیا تھا؟"

"مجھے طعنے نہ دو۔ میں نے حالات سے مجبور ہو کر خدا کے بھروسے پر ایسا کیا ہے خدا کو منظور ہوگا تو وہ آشرم میں بھی صاحبِ ایمان رہے گا۔"

"کیسے رہے گا امی۔ آپ مجھے بہلا رہی ہیں۔"

"اسے بہلاوہ سمجھ کر صبر کر لو۔ اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ ہم اس شہر میں نہیں رہیں گے...."

*

اناتھ بالک آشرم کے ایک کمرے میں اٹھائیس برس کی ایک حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال شانوں تک ترشے ہوئے تھے سیاہ رنگ کے ماتمی بلاؤز اور اسکرٹ میں اس کے حسن کی چاندنی کھل رہی تھی۔ اس کا نام میریا تھا۔

میریا روزنامہ سندیس کی صفحۂ اوّل کی رپورٹر تھی۔ اخبارات کے حلقے میں وہ بہت ہی تیز طرار سمجھی جاتی تھی۔ لیڈروں اور سیاستدانوں کے راز اڑا کر انہیں اپنے اخبار کی زینت بنا دیتی تھی بڑے بڑے لوگ اس سے خوفزدہ بھی رہتے تھے اور خار بھی کھاتے تھے لیکن اس روز میریا تیز و طرار نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی بالک آشرم سے کسی بچے اور اس کی ماں کا کوئی راز چرا کر اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

وہ خود ایک راز بن کر اس آشرم میں پہنچی تھی اور بار بار اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے پنڈت جی کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کتنے ہی آرام سے بیٹھو، پر انتظار کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ اس لئے وہ رہ رہ کر

پہلو بدل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آشرم کی بوڑھی ملازمہ اس کے پاس آئی تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ملازمہ نے کہا۔

"بیٹھو بیٹی۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی ذرا دیر ہے۔ پنڈت جی خود ہی تمہیں بلائیں گے۔"

وہ بیٹھ گئی۔ ملازمہ نے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیسا کلجگ ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ آج سویرے میں آشرم کا دروازہ کھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ایک ننھے بچے کو ہمارے دروازے پر رکھ کر جا رہی ہے میں نے اسے پکارا تو وہ بھاگتی چلی گئی۔ مجھے ..... دمے کی بیماری ہے نہیں تو میں دوڑ کے اسے پکڑ لیتی۔"

میریا نے وقت گذارنے کیلئے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے اس عورت کو اچھی طرح دیکھا تھا؟"

"اچھی طرح تو نہیں، مگر ہاں دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے میں سیندور نہیں تھا۔ یا تو وہ ودھوا (بیوہ) ہو گی یا پھر مسلمان۔"

"ایسے وقت جب کہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ ایک مسلمان عورت اپنے بچے کو اس آشرم میں کیوں چھوڑے گی۔"

"بیٹی! جس کا کوئی باپ نہ ہو اس کا کوئی دھرم بھی نہیں ہوتا۔ وہ بچہ اس بوڑھی کا نہیں ہو سکتا۔ اس کی کسی جوان بہن یا بیٹی کا ہو گا۔"

بوڑھی ملازمہ کی یہ بات میریا کے دل کو لگ گئی کہ جس کا باپ نہ ہو اس کا کوئی مذہب بھی نہیں ہوتا۔ واقعی دنیا کا ہر مذہب مرد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ محمد احمد۔ رام ایشور اور ٹونی ہڈسن جیسے ناموں والے کسی باپ کے جائز بچے کا مذہب سمجھ میں آ جاتا ہے یہ مرد کیلئے بڑے فخر کی بات ہے اور یہ بھی بڑے فخر کی بات ہے اس کے ناجائز بچے کا مذہب سمجھ میں نہیں آتا۔ جب کہ وہ اپنی سوسائٹی میں بیٹھا روزے نماز کی باتیں کر رہا ہو گا۔ یا بھگوان کی مورتی

کے سامنے ڈنڈوت کر رہا ہو گا یا مسیح کے بت کے سامنے سینہ پر صلیب کا نشان بنا رہا ہو گا۔ کیا مذہب یا دھرم کا تقدس اسی طرح قائم رہ سکتا ہے؟

میریا نے پوچھا "جو بچہ تمہارے دروازے پر پڑا ہوا تھا کیا اسے آشرم میں رکھ لیا گیا ہے؟"

"ہاں یہ آشرم ایسے ہی بچوں کے لئے ہے۔"

"مگر آشرم کے کھاتے میں بچے کے باپ کا نام اور دھرم کیا لکھا جائے گا؟"

"یہاں بچوں کے ماں باپ کے نام نہیں لکھے جاتے کیونکہ یہاں آنے کے بعد بچوں سے ان کے تمام رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بچے ہمارے دھرم کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

"ہاں جب کوئی نام نہ رہے تو بچے کسی بھی دھرم کی گود میں جا سکتے ہیں ماں باپ کو کسی پہلو سے اعتراض کرنے کا حق نہیں رہتا۔"

میریا نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر لیں مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے سامنے کمرے کا دروازہ کھُل گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر بائیس برس کی ایک حسینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بدن پر قیدیوں کا لباس تھا اور اس کے آس پاس دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک پولیس انسپکٹر نظر آ رہا تھا۔

میریا نے اس قیدی حسینہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بھارتی فلموں کی سب سے مشہور اداکارہ پشپا رانی تھی۔ دیش کے تمام فلمی رسالے اور نوجوانوں کے تمام بیڈروم اس کی تصویروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ قیدی کے لباس میں اور آشرم کے پس منظر میں ایسی تصویر بنی ہوئی تھی جسے وہ خود اپنی زندگی کے کسی بھی خوبصورت کمرے میں لگانا پسند نہ کرتی۔ ایسی تصویریں تو صرف تقدیر کے بے حس کیمرے میں اُترتے ہیں

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"تم رُک کیوں گئیں آگے بڑھو۔"

پشورانی چونک کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بوجھل قدموں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کسی قیامت سے گذر رہی ہے اور اپنے پیچھے اپنی زندگی کا اہم سرمایہ چھوڑ کر جا رہی ہے وہ چلتے چلتے رک گئی۔ جنونی انداز میں اپنے سر کو انکار میں ہلانے لگی۔

"نہیں نہیں۔ میں اُسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میرا لعل میرا بچہ۔ مجھے واپس کر دو...."

وہ پلٹ کر واپس کمرے کی طرف بھاگی چاہتی تھی مگر سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ پھر انسپکٹر کے حکم پر اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگے۔ میریا کا کلیجہ کانپنے لگا۔ ایک ماں کو اس کے بچے سے جدا کیا جا رہا تھا۔ ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے کہ عورت کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر یا نوچ کر اس سے الگ کر دیا جائے۔ پھر وہ قانون کے محافظ اس جنم جلی کو زبردستی کہاں لے جا رہے تھے اگر پشورانی نے پاپ کیا تھا تب بھی دنیا کی کسی قانونی کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ بچے کو اس کی پاپن ماں سے جدا کر دیا جائے پھر یہ قصہ کیا ہے۔ دوسروں کے رازوں کو ٹٹول کر کہانیاں بنانے والی میریا نے سوچا۔ اس المناک منظر کے پیچھے ایک ملّا اور اس کے بچے کی دردناک داستان ہے اس داستان کو کریدنا چاہیئے۔

بعض اوقات زندگی اتنی فرصت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جا سکے۔ میریا کا دھیان بٹ گیا۔ پنڈت جی نے دروازہ کھول کر کہا۔

"بیٹی میریا۔ اندر آجاؤ"

میریا سر جھکا کر دروازے کے پاس آئی۔ پھر پنڈت جی کے سامنے سے گذرتی ہوئی کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پنڈت جی نے دروازے کو بند کرنے کے بعد میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے پنڈت گردھاری لال کہتے ہیں۔ بیٹی ہم جان بوجھ کر کسی دوسرے دھرم کے بچے اپنے ہاں نہیں رکھتے۔ ہاں کوئی مجبوری ہو تو دوسری بات ہے۔ اب یہی دیکھو کہ آج سویرے سویرے کوئی بوڑھی عورت ہمارے دروازے پر ایک بچے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسی

حالت میں ہم بچے کو کہیں پھینک نہیں سکتے۔ بھگوان کسی کو اتنا کٹھور نہ بنائے"

میریا نے قدرے مایوس ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ میرے بچے کو نہیں رکھیں گے؟ میں۔ میں ایک عیسائی ہوں"

"بیٹی! تم اپنے دھرم کے انوسار اپنی عیسائی مشنری میں بچے کو رکھ سکتی تھیں۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ روزنامہ "سندیش" کے ایڈیٹر سودیش مکرجی نے یہاں آکر ہم سے پرارتھنا کی تھی کہ ہم تم سے کچھ نہ پوچھیں۔ تمہارے بچے کو ہندو سمجھ کر رکھ لیں۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنے کے لئے بلایا گیا ہوں کہ بچے کا دھرم بدل جائے تو تمہیں انکار تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ ہر مذہب میں تھوڑے بہت شیطان ہوتے ہیں ان کے بچے اگر کسی بھی مذہب کی پناہ میں آکر انسان بن سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی مجھے انکار نہیں ہے"

"بس میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب میرے من میں یہ بات کھٹکتی نہیں رہے گی کہ میں نے کسی کے بچے کو اپنی اچھا سے اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ اب تم جا سکتی ہو"

میریا جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی آدھی جان یہاں چھوڑ کر جا رہی ہوں"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

"تم بڑی دھیرج والی ہو۔ اتنی خاموشی سے آنسو بہا رہی ہو۔ دوسری مائیں تو یہاں گود خالی کرتے وقت دھاڑیں مار مار کر روتی ہیں ابھی تم نے ایک ناری کو اسی طرح چیختے چلاتے اور روتے دیکھا ہوگا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"ہاں پشورانی کی آنکھ اور میرا دل دونوں ساتھ رو رہے تھے۔ میں۔ میں یہاں

سے جانے سے پہلے آ۔ آخری بار اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آشرم میں یہ میرا آخری دن اور آخری خواہش ہے پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔"

"بیٹی! خواہش کبھی آخری نہیں ہوتی۔ جب تک سانس چلتی رہتی ہے ایک کے بعد دوسری خواہش مچلتی رہتی ہے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا مگر تمہارے ایڈیٹر سودیش مکرجی جب بچے کو ہسپتال سے لے کر یہاں آئے تو انہوں نے کہا کہ تم نے بچے کی صورت نہیں دیکھی ہے۔"

"ہاں! مکرجی کا خیال تھا کہ بچے کی صورت دیکھ کر میری ممتا تڑپنے لگے گی پھر میں اسے چھوڑنے کا ارادہ بدل دوں گی مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اُسے دور سے ایک نظر دیکھ کر چلی جاؤں گی۔"

"مگر بیٹی! تم اپنے بچے کو کس طرح پہچانو گی۔ صبح سے اب تک یہاں چار بچے آچکے ہیں ان میں سے ایک لڑکی ہے باقی تین لڑکے ہیں۔ تم اپنے بیٹے کو کیسے پہچانو گی؟"

"آں! میں یا سوچنے لگی۔ میں کیسے پہچانوں گی؟ کیا میرا بچہ مجھے دیکھتے ہی پکارے گا؟ یہ کیسا احمقانہ خیال ہے؟"

پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

"میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ مگر مجبوری ہے تینوں لڑکے ہم رنگ اور ہم عمر ہیں تینوں کا جنم دن پندرہ ستمبر ہے۔"

*

کنٹرول ٹاور کی عمارت کے باہر اخبارات کے رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کیپٹن ہری رام اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ میز کے دوسری طرف فلائنگ کلب کا لائن آفیسر رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

"سر! آج پندرہ ستمبر ہے آج کی تاریخ میں دو دن پہلے ہی طیارہ چارٹرڈ کرایا گیا تھا

چارٹرڈ کرانے والے کا نام ہمیش چندر چڑجی تھا۔ وہ ہمیش اسٹیل ملز کے مالک تھے۔"

کیپٹن رام نے پوچھا

"ہمیش چندر آج فلائنگ کلب میں کب آئے تھے؟"

"صبح پونے نو بجے۔"

"ان کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟"

"ان کے ساتھ ان کی دھرم پتنی اور پانچ سال کا ایک لڑکا تھا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا پانچ برس کا تھا؟"

"ہمیش چندر اس لڑکے کو گود میں اٹھا کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے اسے پیار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج وہ اپنے بیٹے کی پانچویں سالگرہ منا رہے ہیں۔"

"ہم۔ ان کا پتہ بتایئے۔"

"وہ کلکتہ سے آئے تھے۔ دارجلنگ میں ان کا ایک کاٹیج ہے پتہ ہے تن سنگ روڈ دارجلنگ۔"

"اتنے میں سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"سر ہیلی کاپٹر واپس آگیا ہے۔ اس عمودی چٹان کے آس پاس بہت سی چٹانیں ابھری ہوئی ہیں اس لیئے وہاں ہیلی کاپٹر لینڈ نہیں ہو سکتا۔ ان کی رپورٹ ہے کہ بچہ حرکت کر رہا ہے ہیلی کاپٹر سے کمبل اور کھانے پینے کی چیزیں پھینکی گئی ہیں ......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی کھلے ہوئے دروازے سے تمام رپورٹر اور فوٹو گرافر دفتر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے طرح طرح کے سوالات شروع کر دیئے تھے کیپٹن نے باری باری ہر سوال کا جواب دیا۔

"طیارہ فلائنگ کلب سے چارٹرڈ کیا گیا تھا۔"

"اسٹیل مل کے مالک کروڑپتی ہمیش چندر چڑجی گرمیاں گذارنے کیلئے دارجلنگ آئے

تھے۔ ان کے ساتھ ان کی دھرم پتنی اور ان کا بیٹا تھا۔ حادثہ میں ہمیشہ چندر اور ان کی پتنی ہلاک ہو چکے ہیں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر صرف اُن کے پانچ سالہ بچے کی زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج پندرہ ستمبر ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان سالگرہ کا دن گذار رہا ہے۔

*

سالن کے جلنے کی بو آئی تو بانو چونک گئی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ باورچی خانے میں چولہے کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور تھوڑی دیر بعد کیپٹن سر تاج حسین اپنی سالگرہ منانے اس کے گھر آنے والا ہے۔

سوچ کی رفتار، آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ سوچتے سوچتے پلک جھپکتے ہی دو سال پیچھے آصف کے پاس پہنچ گئی تھی اس کی بیوی بن گئی تھی۔ پھر ایک بچے کو جنم دیکر واپس باورچی خانہ میں آگئی تھی۔ تاکہ سر تاج حسین کیلئے بریانی اور سالن تیار کر سکے۔

تنہائی میں ماضی کی طرف دیکھتے ہی بچے کا خیال دل میں کچوکے لگانے لگتا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے تھے " وہ کہاں ہوگا۔ اب پورے دو برس کا ہوگیا ہوگا۔ دو برس کے بچے " اماں اماں " کہنے لگتے ہیں۔

اسی وقت اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔

" بانو کیا سوچ رہی ہو ؟ کھانا تیار ہو گیا ؟ "

" آں! جی ہاں۔ سالن ذرا جل گیا ہے۔ مگر کھانے کے قابل ہے۔ "

" اچھا۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر لباس بدل لو۔ میں اسے ساتھ لے آئی ہوں وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔ "

" کون ؟ " بانو نے بے خیالی میں سوال کیا۔ حالانکہ وہ سمجھ گئی تھی۔

" یہ لو، کیا تم اتنی جلدی بھول گئیں ؟ وہی فوجی افسر اس نے مجھے اپنا نام بتایا ہے

جانتی ہو اس کا نام سر تاج حسین ہے جلدی جاؤ۔ بیچارہ برسوں سے تنہا زندگی گذار رہا ہے۔ اسے احساس دلاؤ کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے "

وہ وہاں سے جانے لگی۔ پھر یک بیک پلٹ کر بولی۔

" امّی آپ کو تو معلوم ہوگا دو برس کے بچے اماں کہنے لگتے ہیں "

ماں نے بیٹی کو بڑے کرب سے دیکھا پھر قریب آکر محبت سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

" بیٹی بچے اپنی ماؤں کو اماں یا امّی کہتے ہی ہیں لیکن تمہارا کوئی بچہ تھا اور نہ ہے میں نے کئی بار سمجھا دیا ہے کہ دو برس پہلے کی بانو کو مار ڈالو۔ تم نے نیا جنم لیا ہے۔ اگر شادی کی بات چل نکلی تو تم پہلی بار دلہن بنوگی۔ سر تاج تمام راستے تمہاری باتیں کرتا آیا ہے جاؤ وہ انتظار کر رہا ہوگا "

وہ منہ ہاتھ دھونے کیلئے غسل خانہ کی طرف چلی گئی۔ اس کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ ماضی ستا رہا تھا اور مستقبل کی مسرتیں اپنی طرف بلا رہی تھیں ماں بار بار سمجھاتی تھی کہ جو پیچھے دیکھ کر چلتے ہیں وہ آگے ٹھوکر کھاتے ہیں وہ بچہ جسے ماں کی بدنصیبی کھا گئی وہ دوبارہ واپس نہیں آئے گا اگر وہ پھر سے سہاگن بنے گی! ۔ تو پھر اس کے آگے پیچھے بچے ہی بچے ہوں گے۔

ماں اُسے خوشگوار زندگی گذارنے کا سبق پڑھاتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ پچھلا سبق ہمیشہ یاد رہتا ہے کوئی بھی تخلیق کار اپنے پہلے فن پارے کو کبھی نہیں بھولتا۔ دس بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی بانو اپنی پہلی تخلیق کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

جب وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس بدل کر آئینہ کے سامنے آئی تو کچھ دیر تک اپنے آپ کو دیکھتی رہ گئی۔ آئینہ میں جو بانو تھی وہ بالکل کورے کاغذ کی طرح تھی۔ جیسے ابھی تک اس پر کسی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ اور نہ ہی اس کاغذ پر کبھی کسی بچے کی تصویر بنائی گئی تھی۔ اس لئے

تو سرتاج بے اختیار اس کی طرف کھنچتا چلا آیا تھا۔ بانو کو اس کی بات یاد آ گئی۔

"تم چاہو تو مجھے سرتاج کہہ سکتی ہو۔"

وہ آئینے کے سامنے شرما گئی۔ اس نام کے سائے میں شادی کا پیغام تھا۔ سرتاج کا پیار بھرا لہجہ کہہ رہا تھا کہ تمام مرد آصف کی طرح سنگدل اور بے حس نہیں ہوتے۔ وہ پھول کو پھول کی طرح اٹھاتے ہیں اور آخری سانس تک زندگی کے خوبصورت گلدان میں سجا کر رکھتے ہیں

وہ سوچنے لگی۔ ہائے ایسی محبت اور مسرت اب تک کہاں تھی۔ اتنی دیر سے کیوں آئی ہے؟

سوچ کی نگری میں ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے اسے احساس ہوا کہ وہ آئینے کے سامنے بڑی دیر سے سوچ میں کھڑی ہے۔ سرتاج ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا ہوگا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ کر اس کی تیز رفتاری برقرار نہ رہی۔ شرم و حیا نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ دروازے کے ایک پٹ کو تھام کر دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ سرتاج کے دل کے کسی گوشے میں قدم رکھنے والی ہے۔

اسی وقت پتہ چلا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں۔ اسے امی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"بیٹا بانو بڑی شرمیلی ہے۔ وہ اس طرح نہیں آئے گی میں اُسے بلا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں امی! آپ نہ جائیں۔ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر ڈر لگتا ہے کہ آپ ناراض ہو جائیں گی۔"

"بیٹے کیسی باتیں کرتے ہو، جب تمہیں بیٹا کہا ہے تو تمہاری کسی بات پر ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔ تم بلا جھجک کہو۔"

"امی بات یہ ہے کہ میری شرافت کی گواہی دینے کیلئے میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے شریف اور ایماندار سمجھتی ہیں تو ـــ تو بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیں۔ میں اسے اپنی عزت بنا کر ہمیشہ اس کی عزت کروں گا۔"

اچانک ہی بانو کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔
نگاہوں کے سامنے آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔
ایک ماہتابی تیزی سے سرسراتی آسمان کی بلندی کی طرف جانے لگی۔
اس کے ساتھ ہی وقت کا پنچھی تیزی سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا اڑتا چلا گیا۔
ایک ماہ گذر گیا۔

وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہنے۔ گھونگھٹ نکالے سہاگ کی سیج پر بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کے سائے میں ہر کنواری کا دل گھبراتا ہے کہ پتہ نہیں اب کیا ہونے والا ہے لیکن وہ تو کنواری نہیں تھی۔ کلی سے پھول یا لڑکی سے عورت بننے کے بعد کنوارے گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ کیا پردہ اٹھنے کے بعد بھی وہ اپنے سرتاج سے چھپی رہ سکے گی؟ اگر چھپ نہ سکے اور ماضی کھل کر سامنے آ جائے تو کیا ہوگا؟ کیا دوسری بار طلاق ہوگی؟ یہی سوچ کر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

وہ سہاگن بن کر مسرتوں کے ہجوم میں خوفزدہ تھی۔ بعض اوقات انسان کو ایسے ہی ڈسنے دھمکانے والی خوشیاں ملتی ہیں ایسی خوشیاں خدا نہیں دیتا۔ بلکہ انسان خود خریدتا ہے ایک دوسرے سے لین دین کے موقع پر اگر ایک اپنا سب کچھ دیکر بھی کچھ چھپا لیتی ہے تو بے پناہ مسرتیں حاصل کرنے کے باوجود سہم سہم کر زندگی گزارتی ہے۔

سوچتے سوچتے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ گھونگھٹ کے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی وہ سمجھ گئی کہ ...... سرتاج حسین سہاگ کے کمرے میں آ گیا ہے اسے سمجھنے کا جو تجربہ تھا وہ تجربات کے مطابق اور زیادہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے تمام دولہا آصف کی طرح ایک ہی انداز میں ریکارڈ کی مانند بولتے ہیں اور گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنا قرض وصول کرنے لگتے ہیں لیکن جب سرتاج نے اس کے قریب بیٹھ کر اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولنا شروع کیا تو بانو کا تجربہ غلط ہو گیا کہ تمام دولہا اپنی خواہشات کو اہمیت دیتے

ہیں اس کے برعکس وہ سہمی ہوئی دلہن کی دلجوئی کرتے ہیں ۔ اسے دائمی محبت اور دائمی تحفظ
کا یقین دلاتے ہیں ۔

سرتاج حسین کا انداز ایسا تھا کہ بانو کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا ۔ اس
کے دل و دماغ میں جو خوف سمایا ہوا تھا وہ آپ ہی آپ دور ہو گیا بعض مرد ساحر
ہوتے ہیں اس لئے تو وہ سحر زدہ ہو گئی تھی ۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب اور
کیسے اپنے سرتاج کی آغوش میں چلی گئی ۔ تب سرتاج نے کہا ۔

" آج سے تم مجھ میں ہو اور میں تم میں ہوں ان حسین لمحات کے بعد ہمارے درمیان
کوئی پردہ نہیں رہے گا میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم سے پہلے میری زندگی میں دو لڑکیاں
آچکی ہیں ۔ اگر تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی آیا ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ ۔۔۔۔ "

بانو کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہو گئیں ۔ جو خوف مٹ گیا تھا وہ یکبارگی
اس کے اندر زلزلے کے سے جھٹکے پہنچانے لگا ۔ وہ ہزار ضبط کے باوجود کانپنے لگی ۔ وہ اپنی
دانست میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن بعض باتوں کا ردِعمل بے اختیار ہوتا
ہے اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا ۔ سرتاج چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ جواباً
کچھ بولے گی پھر وہ خود ہی بولا ۔

" تم لرز رہی ہو ۔ میں سمجھ گیا ۔ میں پہلا شخص ہوں جو تمہاری زندگی میں آیا ہوں ۔
یہ تمہارے بدن کی کنواری کپکپاہٹ ہے میں سمجھ گیا ۔ بالکل سمجھ گیا ۔۔۔۔ "

بانو کو یوں لگا جیسے وہ طنز کر رہا ہے مگر وہ تو پیار کر رہا تھا اس کی سانسوں کے
راستے دل میں اتر رہا تھا ۔ جس بات کا جواب وہ نہ دے سکی تھی ۔ سرتاج اس بات کو اس
کی اداؤں میں ڈھونڈ رہا تھا ۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ سرتاج سراغرساں بن گیا ہو ۔ بانو کے
دل کا چور ایسا سوچ رہا تھا ۔ حالانکہ سب ہی شوہر اپنے حقوق کے مطابق ایسے وقت سراغرساں
بن کر پیار سے تفتیش کرتے ہیں ۔

کمرے میں گہری تاریکی تھی ۔ اس تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی
اس لمحے کچھ احساسات تھے کہ وہ آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے ۔ اسے جھوٹ
کا سرطان ہو گیا ہے اور سچائی کے نشتر سے اس کا آپریشن کیا جا رہا ہے کیا واقعی
دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال ہے جہاں سے جھوٹ کی میڈیکل رپورٹ حاصل کی جا سکتی ہو ؟
" نہیں " بانو نے بڑے حوصلے سے سوچا " کوئی میرے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکتا
اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا تھا کہ محبت کرنے والا شوہر ملے گا تو اس سے کچھ نہیں
چھپاؤں گی مگر امی نے مجھے اس بچے کی قسم دی ہے جو نہیں ہے اور ہے ۔ انہوں نے التجا کی
ہے کہ اب میں کسی پر اعتماد نہ کروں ۔ سرتاج خواہ کتنا ہی شریف ایماندار اور محبت کرنے
والا شوہر ہو وہ ایک باسی دلہن کو کبھی برداشت نہیں کرے گا "

وہ بڑی قیامت کی رات تھی ۔ گذرنا ہی نہیں چاہتی تھی اندیشے تھے کہ دل میں گھر
کر رہے تھے اور اس کے چاروں طرف کی تاریکی اُسے دلاسے دے رہی تھی کہ اسے پریشان
نہیں ہونا چاہئیے ۔ رات کی تاریکی میں اور ماں کے پیٹ میں ہر بات چھپ جاتی ہے ۔
رات کے پچھلے پہر سرتاج اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا ۔ پھر اس کے پٹ کھولنے
کے بعد ایک سگریٹ سلگانے لگا ۔ بانو نے جھجکتے ہوئے کروٹ بدل کر اس کی جانب
دیکھا ۔ کھڑکی کے باہر تاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہا
تھا اس کی پشت بانو کی طرف تھی تھوڑی سی دیر تک دونوں کے درمیان بڑی پُراسرار
سی خاموشی رہی ۔ پھر وہ ایک سگریٹ کا ایک کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد ہنسنے لگا ۔
وہ کس پر ہنس رہا تھا ۔ بانو پر یا اپنے آپ پر ؟ ہنسنے کی کوئی وجہ تو ہو گی ۔ بغیر
کسی وجہ کے صرف پاگل ہنستے ہیں ۔

" میں بھی کیسا نادان ہوں کہ اپنے سامنے کے ہر انسان سے یہ توقع کرتا ہوں
کہ وہ پوری سچائی سے میرے سامنے آئے یہ سراسر حماقت ہے ہر انسان کا اپنا ایک ماضی

اپنے چند راز اور اپنا غرور ہوتا ہے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اُس کے ذاتی معاملات کی چھان بین کرے۔"

اس نے پھر سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اندھیرے میں سگریٹ کی آگ دہکنے لگی بانو کو یوں لگا جیسے وہ اس کے سلگتے ہوئے دل کو پھونک رہا ہو۔ آخر اس نے کہا۔

"بانو! میں یہ نہیں سمجھا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اگر چھپایا ہے تو پھر ہمیشہ چھپا رکھنا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری انانیت کو ٹھیس نہ پہنچے۔ تم میری عزت ہو اور تمہاری عزت رکھنا میرا فرض ہے۔"

بانو اس کی محبت اور شرافت کا یہ انداز دیکھ کر تڑپ گئی اس کے جی میں آیا کہ وہ ابھی جا کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے اور اپنے ماضی کی ایک ایک بات اسے بتا دے مگر کون سی بات؟

وہ تو سوچ رہا ہوگا کہ اس کی دلہن کی زندگی میں پہلے بھی کوئی آ چکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے کنواری نہیں سمجھ رہا ہوگا۔ لیکن اتنی دور تک نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ عورت سرتاج جیسے شوہر پر اپنی جان بھی قربان کر دیتی ہے مگر عورت کی جو انا ہوتی ہے اسے ٹھیس نہیں پہنچاتی۔ اپنے دل کی بات خود کبھی زبان کی نوک تک نہیں لاتی۔ بانو کے ساتھ بھی یہی عورت کی مجبوری تھی جسے وہ خود سمجھ سکتی تھی۔ اپنے ضمیر کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

وہ قیامت کی رات کسی طرح گذر ہی گئی دوسری صبح ناشتہ کی میز پر ماں موجود تھی اور بڑی خاموشی سے بیٹی اور داماد کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی سرتاج اپنی عادت کے مطابق ہنس بول رہا تھا۔ بانو کچھ چپ چپ سی تھی لیکن سرتاج کی کسی کسی بات پر شرما کر مسکرا دیتی تھی۔ ماں کو اعتماد ہو گیا کہ بات بن گئی ہے۔ جب داماد خوش ہے تو بانو کی قسمت بھی خوش ہے بانو تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر چپ چپ سی رہتی ہے۔

پھر دن، ہفتے اور مہینے گذرنے لگے۔ سرتاج نے پھر کوئی ایسی بات نہیں چھیڑی جو بانو کے دل پر بوجھ بن جاتی۔ وہ تو پہلے دن سے ہی اُس کا دیوانہ بن گیا تھا اور اس کی دیوانگی بدستور قائم تھی مشکل یہ ہے کہ انسان کو کسی کروٹ قرار نہیں ملتا۔ بانو کے دل سے خوف اور اندیشے دور ہوئے تو وہ سرتاج کی دیوانہ وار محبت سے گھبرانے لگی۔ وہ اپنے خلوص اور محبت سے عظمت حاصل کر رہا تھا اور وہ تھی کہ آپ اپنی ہی نظروں سے گرتی جا رہی تھی۔

ایک سال بعد سرتاج نے اس کے لئے دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کا چھوٹا سا مکان بنایا اور اس کے ہاتھ میں مکان کی چابی دیکر کہا۔

"یہ تمہارا گھر ہے اس کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے کھولو۔ اور اپنی محبت سے اس گھر کو جنت بنا دو۔"

اپنے مکان کا پہلا دروازہ کھولتے وقت بانو کے ہاتھ کانپ رہے تھے ایک وہ آصف تھا جو گھر لوٹ کر چلا گیا تھا۔ ایک یہ سرتاج تھا جس نے اپنی محنت کے گاڑھے پسینے سے محبت کا وہ چھوٹا سا "تاج محل" بنایا تھا۔ کیا وہ اس گھر کو اس کے لئے جنت بنا سکتی تھی؟ مگر کیسے بنا سکتی تھی اس نئے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ اگر وہ بچہ آصف کا نہ ہوتا۔ سرتاج کا ہوتا تو وہ اُسے بانہوں میں لے کر اس نئے مکان میں قدم رکھتی۔ پھر اس کے اور سرتاج کے درمیان کوئی جھوٹ اور بے اعتمادی نہ ہوتی۔

جب دو برس گذر گئے تو سرتاج نے ایک رات اسے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔
"کیا بات ہے کیا ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں ایک ننھا سا پھول نہیں کھلے گا۔"
بانو اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔
"میں کیا کہوں۔ یہ تو خدا کی دین ہے، وہ جب چاہے۔ گود میں پھول کھلا دے۔"
ایسا کہتے وقت اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار سے

لگے ہوئے کیلنڈر پر گئی۔ کیلنڈر پندرہ ستمبر کی تاریخ بتا رہا تھا اس کا دل جیسے حلق میں آ کر دھڑکنے لگا۔

"اوہ خدایا! اب تو میرا لعل چار برس کا ہو گیا ہوگا۔ وہ ابھی کیا کر رہا ہوگا؟"

ایسے وقت شوہر سے وفا کرتے کرتے ایک ننھی سی دیوار حائل ہو جاتی تھی۔ اگر بچہ نگاہوں کے سامنے ہو تو اسے چھوڑ کر شوہر کے سینے سے لگا جا سکتا ہے مگر نگاہوں سے اوجھل ہو تو ازدواجی محبت کے درمیان وہ عورت کو بیوی کے بدلے صرف ماں بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بانو کو یہ ممتا بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔

ایک برس اور گذر گیا۔ پندرہ ستمبر کی صبح بانو کی آنکھ کھلی تو اسے سب سے پہلے یاد آیا کہ بیٹے سے بچھڑے پورے پانچ سال گذر چکے ہیں اگر وہ آج موجود ہوتا تو صبح ہی سے اس کی پانچویں سالگرہ کی تیاری شروع ہو جاتی۔ محلے کے بچوں کو مدعو کیا جاتا۔ گانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ میرا بیٹا تمام بچوں کے درمیان شہزادہ نظر آتا۔ کیسا ہنگامہ ہوتا۔ یہ گھر خوشیوں سے بھر جاتا۔

اس کی نظر گھڑی پر گئی نو بج گئے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اب اسے سرتاج کا خیال آیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ صبح دیر تک سوتی رہتی تھی اور سرتاج ناشتہ کئے بغیر ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا وہ بستر سے اٹھ کر اپنی کوتاہیوں کا احساس کرتی ہوئی مکان سے باہر لان میں آئی۔ اس خیال سے کہ شاید وہ ابھی لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہو۔ مگر وہ نہیں تھا۔ ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر اسے ایک طیارے کی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ چھوٹا سا طیارہ زندگی کے ایئرپورٹ سے پرواز کرتا آیا ہے اور موت کے رن وے پر لینڈ کرنے والا ہے۔

اس کے دل نے دھڑک دھڑک کر یہ نہیں بتایا کہ اس طیارے میں ایک پانچ برس کا ننھا سا مسافر اپنی پانچویں سالگرہ منا رہا ہے۔

وہ جیسے پانچ برس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک کانٹے کی طرح چبھتا رہا تھا۔ اس کے خون میں ابال نہیں آیا کہ اس کے خون کا ایک چھینٹا اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرواز کرتا گزر رہا ہے۔

ہاں! اچانک ہی اس کے دل میں درد سا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ درد کون سے چور دروازے سے آیا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔

*

خبریں عموماً اخبارات سے پہلے ریڈیو پر نشر ہو جاتی ہیں۔ دیس کے تمام ریڈیو اسٹیشن پانچسالہ جانی کے متعلق خبریں سنا رہے تھے۔ طیاروں کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں حادثات میں مرنے والوں پر افسوس بھی کیا جاتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان حادثات کو بھلا دیا جاتا ہے لیکن یہ خبر سن کر ہر ماں باپ کا دل دہل گیا کہ ایک پانچ برس کا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہے یہ خبر سن کر کوئی ماں ایسی نہیں تھی جس نے اپنے بچے کو فوراً ہی کھینچ کر سینے سے نہ لگا لیا ہو۔

ڈیلی ایوننگ ٹیلی گرام کے ایڈیٹر نے ریڈیو سوئچ کو آف کرتے ہوئے اپنے رپورٹر داس دیو سے کہا۔

"داس دیو! اپنے فوٹوگرافر کے ساتھ فوراً دارجلنگ پہنچو۔ وہاں پہنچ کر جانی کا کاٹیج کی تصویر لو۔ کاٹیج کے اندر پہنچ کر اس بچے کے خالی بستر کی بھی ایک تصویر اتارو۔ وہاں جو لوگ ہوں ان کے بیانات لے کر ایک معصوم بچے کے متعلق ایسی لرزہ خیز کہانی بناؤ کہ پڑھنے والوں کے دل دہل جائیں۔ یہ سنہری موقع ہے ہمارے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔"

"میں سمجھتا ہوں باس! جب دھماکہ خیز خبریں شائع نہ ہوں۔ اخبار ہاتھوں ہاتھ نہیں بکتا......"

ایڈیٹر نے کہا "صرف دھماکہ خیز سچی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ ان خبروں میں نمک

مرچ اور دوسرے مصالے لگانے پڑتے ہیں۔ مثلاً ہم جانی کے خالی بستر کی ایک تصویر شائع کریں گے اور اس کے نیچے لکھیں گے کہ اس آرام دہ بستر پر ماں کی لوریاں سننے والا جانی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پتھریلی چٹانوں کی گود میں پڑا ہے ہمارے دیس کی کوئی ماں اپنی لوری کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتی .... کہو یہ کیسا نیوز اسٹنٹ ہوگا؟"

"غضب ہو جائے گا باس! ایسی باتیں پڑھ کر تمام مائیں چیخنے لگیں گی۔"

"یہی تو پوائنٹ ہے جب عورتیں چیخیں گی اور ضد کریں گی تو اُن کے پتی یا پتا ہمارا اخبار خریدنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بس اب جلدی سے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ روزنامہ سندیس کی میریا تم سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ کوشش کرو کہ وہ شیطان کی خالہ تم سے پہلے کوئی خاص معلومات حاصل نہ کر سکے۔"

"ایسا ہی ہوگا باس! وہ کتنی ہی چالاک ہو مجھ سے بازی نہیں لے سکے گی۔"

ایسا ہی ہوا سب سے پہلے داس دیو اپنے فوٹو گرافر کو لیکر دارجلنگ پہنچ گیا۔ جانی کا کالج ایک پہاڑی کے دامن میں تھا جب داس دیو کالج کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو مالی نے احاطہ کا دروازہ کھولا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ داس نے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"ہاں صاحب! میں یہاں کا مالی ہوں مگر آج یہاں کی پھلواری اجڑ گئی ہے۔"

"واہ واہ کیا دل کو لگنے والی بات کہی ہے، ٹھہرو میں اسے لکھ لیتا ہوں۔"

اس نے نوٹ بک میں لکھنے کے بعد کہا۔

"تم اس کھمبے سے ٹیک لگا کر آسمان کی طرف یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھو۔ جیسے یہ آسمان جانی کے جانے کے بغیر ننگا ہو گیا ہو۔ ہم تمہاری یہ تصویر اخبار میں چھاپیں گے۔"

پھر اس نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ تصویر اتارنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اسی

وقت میریا کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بلاشنگ کلر کا بلاؤز اور اسکرٹ پہنے اپنے شانے سے ایک کیمرہ لٹکائے کھڑی تھی اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مسٹر داس دیو۔ ایک مالی کو اداکار بنانے سے تمہارے اخبار کی مانگ نہیں بڑھے گی صحافت کے پیشے کو مذاق نہ بناؤ۔"

داس دیو نے بات ٹالنے کے لئے مسکرا کر کہا۔

"اچھا تو تم پہنچ گئیں۔ مگر کیا بات ہے آج تم کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو۔ بھئی اس بچے کی ٹریجڈی ماؤں کو اداس کر سکتی ہے اور تم تو ابھی کنواری ہو۔"

میریا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا کہ وہ کنواری مریم ہے کوئی اس کی ممتا کو نہیں سمجھ سکتا جب سے اس پانچ سالہ جانی کی خبر سنی تھی اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کی عمر کا حساب کر چکی تھی۔ اگرچہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جانی وہی بچہ ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک کروڑ پتی سیٹھ کا بچہ اس کے اپنے خون کا پروردہ ہو سکتا ہے وہ تو محض ایک بچے کا درد اپنے دل میں لے کر وہاں آئی تھی اور اپنے روزنامہ کے لئے صحیح خبریں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

وہ کوئی جواب دیئے بغیر کالج کے دروازے کی طرف جانے لگی۔ داس دیو اس سے پہلے تیزی سے چلتا ہوا کال بیل تک پہنچ گیا۔ پھر اس کا بٹن دبانے کے بعد بولا۔

"میریا! یہاں کوئی تیسرا اخبار رپورٹر نہیں ہے آؤ ہم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں یہاں سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ معلومات ہم آپس میں بانٹ لیں گے یعنی معلومات کا جو حصہ میں شائع کروں گا وہ تم نہیں کرو گی اور جو حصہ تم شائع کرو گی وہ میں نہیں کروں گا۔"

میریا نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ لیڈیز فرسٹ کے اصول کے مطابق پہلے میں کہتی ہوں کہ جانی کی تصویر میرے اخبار میں شائع ہوگی۔ سمجھوتے کے مطابق تم اس کی تصویر شائع نہیں کرو گے۔"

داس دیو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جانی تو اہم موضوع ہے اس کی تصویر تمام اخبارات شائع کریں گے۔"

میریا نے کہا۔ "اس طرح جانی کے متعلق جتنی خبریں ہونگی وہ سب ہی اہم ہوں گی لہٰذا فضول سمجھتے بازی سے پرہیز کرو۔"

اتنے میں دروازہ کھل گیا۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کون لوگ ہیں؟"

داس دیو نے اپنے فوٹوگرافر سے کہا کہ آنسو پونچھتی ہوئی اس عورت کی فوراً تصویر اتاری جائے۔ فوٹوگرافر نے کیمرے کی آنکھ سے دیکھا۔ اسی وقت میریا اس بوڑھی عورت کے بالکل قریب آ کر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ کیمرے کا بٹن دبنے کے بعد فوٹوگرافر کو پتہ چلا کہ میریا بھی تصویر میں چلی آئی ہے۔

داس دیو نے جھلا کر کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے کیا ابھی آنسو پونچھنا ضروری تھا؟"

"ہاں! داس دیو۔ ہم پہلے انسان ہیں بعد میں رپورٹر ہیں ایک دکھی عورت کے آنسو پونچھ کر اسے تسلی دینے کے بعد ہم اپنا کام کر سکتے ہیں۔"

بوڑھی ملازمہ نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

"بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔ عورت ہی عورت کے دکھ درد کو سمجھتی ہے۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔"

داس دیو ان سے پہلے ہی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"ماں جی! آپ کا اس بچے کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔"

"میں اس گھر کی ملازمہ ہوں۔ مگر ایک ماں کی طرح دن رات جانی کو گود میں کھلایا ہے میں ان کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ جانی کو ہوائی جہاز کی سیر کرانے کے بعد آتے ہی ہوں گے اس وقت

میں نے ریڈیو لگایا تو یہ منحوس خبر سنائی دی۔ اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ بیٹی! یہ خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں ماں جی!" میریا نے کہا۔ "یہ خبر جھوٹی ہوتی تو ہم یہاں نہ آتے۔ آپ کرپا کر کے جانی کی ایک تصویر ہمیں دے دیں۔ کیا آج جانی کی سالگرہ منائی جا رہی تھی؟"

"ہاں، یہ دیکھو۔ کل رات ہی یہ بڑا برتھ ڈے کیک منگوایا گیا تھا۔"

ملازمہ نے آگے بڑھ کر ایک میز پر سے کپڑے کو ہٹایا۔ وہاں ایک بڑا سا برتھ ڈے کیک رکھا ہوا تھا۔ فوٹوگرافر اس کی تصویر اتارنے لگا خوب صورت سے کیک پر واضح الفاظ میں "پندرہ ستمبر" لکھا ہوا تھا۔ میریا سالگرہ والی بات جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ آج کونسی تاریخ ہے لیکن کیک پر "پندرہ ستمبر" کی تحریر دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے دماغ کی کوکھ میں اس کا بچہ مچل مچل کر پوچھنے لگا۔

"ممی! آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟ دیکھئے نا؟ میرا برتھ ڈے کیک تیار ہے۔ بولیئے نا۔ کیا آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟"

ایک بچہ اندر ہی اندر اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب کچھ ہونے والا ہے اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کر کیا ہو سکتا ہے؟ پانچ برس پہلے تو وہ اندر سے مر چکی تھی۔ مرنے کے بعد اور کون سا المیہ اُسے رُلا سکتا ہے؟

انسان جو سوچ بھی نہیں سکتا وہی اس کے آگے آتا ہے وہ چپ چاپ کھڑی کیک پر لکھی ہوئی تاریخ کو تکتے جا رہی تھی۔

"میں بارہ سال سے ملازمت کر رہی ہوں۔ پانچ برس پہلے میں سیٹھ اور سیٹھانی کے ساتھ خود جانی کو لانے گئی تھی۔"

"لانے گئی تھیں؟" داس دیو نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"یعنی آپ ہسپتال یا میٹرنٹی ہوم سے اسے لانے گئی تھیں؟"

"واں؟" ملازمہ نے ایک ذرا ہچکچانے لگی۔ اور اپنے دونوں بازوؤں کو گود لینے کے انداز میں یوں تکنے لگی جیسے بچے کو اٹھائے بہت دور سے لا رہی ہو۔ پھر وہ حسب عادت بڑبڑانے لگی۔

"اس کے پالنے والے تو سورگ باسی ہو گئے اب یہ جاننے سے کیا فرق پڑے گا کہ وہ ہسپتال سے لایا گیا تھا۔ یا آشرم سے ....."

یہ بات میریا کے سینے میں گولی کی طرح لگی وہ ایک دم سے لڑکھڑا کر صوفہ پر گر پڑی۔ اس سے بے خبر داس دیو نے چٹکی بجا کر کہا۔

"وہ مارا۔ یہ خبر بڑی دھماکہ خیز ہو گی کہ وہ بچہ لے پالک ہے اگرچہ حادثہ میں اس کا باپ اور اس کی ماں مر چکی ہے اس کے بعد بھی اسے جنم دینے والی ماں کہیں زندہ ہو گی۔ اُف! اس خبر سے کیسی سنسنی پھیل جائے گی۔"

ممتا کیسی سنسنی اور کیسے کرب سے گزر رہی تھی۔ یہ میریا کا چہرہ بتا رہا تھا اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ "میرا بچہ ــــ میرا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی۔ ساری بلندیوں کو گرا کر اسے سینے سے لگا لوں گی۔"

وہ تھرتھراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت داس دیو نے کہا۔

"میریا! میں تم سے زیادہ فاسٹ ہوں۔ دیکھ لینا یہ خبر سب سے پہلے میرے اخبار میں آئے گی۔" پھر اس نے ملازمہ سے پوچھا۔ "جانی کو کس آشرم سے لایا گیا تھا؟"

"وہ جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے ....."

ملازمہ کی بات سن کر میریا کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ بچہ اسی کا ہے اس نے داس دیو کا بازو تھام کر کہا۔

"ٹھہرو۔ داس دیو! میری ایک بات مان لو۔ ہم میں سے کسی کو یہ خبر شائع

نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔"

"کیوں؟" داس دیو نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"اس لیئے کہ وہ بچہ ایک کروڑ پتی سیٹھ مہیش چندر کے نام سے پہچانا جاتا ہے اگر تم یہ خبر شائع کرو گے تو اس معصوم بچے سے ایک باپ کا نام چھن جائے گا۔ آئندہ اس کا تمام کیریئر تباہ ہو جائے گا۔"

"میریا! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تم یہ خبر میرے پاس روک کر خود اپنے اخبار میں شائع کرو گی۔ اپنی یہ چالاکی اپنے ہی پاس رکھو۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر جانے لگا۔ میریا نے اسے آواز دی۔ داس دیو نے دروازے سے پلٹ کر میریا کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ اس گھر سے جانی کی ایک تصویر حاصل کرے۔ پھر اس نے بوڑھی ملازمہ سے پوچھا۔

"ماں جی! مجھے یقین ہے کہ آپ جانی کی اصلی ... ماں کو جانتی ہیں کیا آپ مجھے اس کا پتہ بتائیں گی؟"

میریا نے جلدی سے کہا۔

"ماں جی کچھ نہیں .... جانتیں۔ یہ کچھ نہیں بتائیں گی۔"

بوڑھی عورت نے تائید کی "یہ سچ ہے بیٹا! آشرم والوں نے جانی کے ماں باپ کا پتہ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔"

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں میریا! ماں جی کو تمہارا اشارہ مل گیا ہے لیکن میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں آشرم سے معلومات حاصل کروں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ کوئی جواب سنے بغیر کاٹیج سے باہر آ گیا۔ ڈاک خانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر ٹرنک کال کے ذریعے اپنے ایڈیٹر سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ میریا کے مقابلے میں کتنی

تیز رفتاری اور ذہانت سے کام کر رہا ہے۔ فوٹو گرافر شام تک اہم تصویریں لے کر دفتر پہنچ جائے گا اس نے وہ دھماکہ خیز خبر بھی سنا دی کہ جانی بے بالک لڑکا ہے اور اب وہ آشرم کی طرف کو جا رہا ہے تاکہ جانی کی اصل ماں کا سراغ لگا سکے۔

یہ تفصیلی رپورٹ دینے کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن آیا وہاں سے نیرو گیج کے ذریعہ سل گوڑی پہنچا۔ سل گوڑی سے براڈ گیج کے ذریعہ جلپائی گوڑی پہنچ کر اس نے آشرم کا پتہ معلوم کیا۔ پندرہ منٹ کے بعد جب وہ سائیکل رکشا میں بیٹھ کر آشرم میں آیا تو دفتر میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک گیا اس کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ میریا اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر پنڈت گردھاری لال سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے داس دیو کو دیکھتے ہی کہا۔

"داس دیو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ ایک معصوم اور مظلوم بچے کا کیریر تباہ نہ کرو۔ کسی ماں پر کیچڑ نہ اچھالو۔ کیا تمہاری کوئی ماں نہیں ہے؟"

"فضول باتیں نہ کرو میریا! میری ماں ایک آدرش ناری ہے۔"

"تو پھر اس آدرش ناری سے جا کر ــــ پوچھو کہ وہ تمہارے جیسے سپوت کو کسی عورت ذات کی توہین کرنے کی اجازت دے سکتی ہیں یا نہیں؟ اپنا نام کرنے اور اپنا اخبار بیچنے کیلئے آدمی کو اتنا نہیں گرنا چاہیئے۔"

داس دیو نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے پنڈت جی کو مخاطب کیا۔

"شریمان! آپ دھرم کی بات کریں۔ ایک بے بالک بچہ جو اپنے ماں باپ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس بچے کو اس کی اصلی ماں تک پہنچانا کیا ہمارا کرتو (فرض) نہیں ہے؟"

"ہاں بیٹے!" پنڈت جی نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تمہارے جیسے نوجوان اپنے کرتو کو سمجھتے ہیں لیکن تم اس آشرم کے دستور کو نہیں جانتے۔ یہاں جو بچے آتے ہیں ان کی ماؤں کے نام کسی کھاتے میں لکھ کر نہیں رکھے جاتے کیونکہ ایسی ماؤں سے اولاد کا رشتہ ہمیشہ کے

لئے ٹوٹ جاتا ہے اور جو چیز ٹوٹ جاتی ہے اسے سنبھال کر نہیں رکھا جاتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" داس دیو نے کہا۔ "ہم آپ جب دفتر کھول کر بیٹھتے ہیں تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب رکھتے ہیں پھر یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ماں اور بچے کا حساب یہاں نہیں رکھا جاتا ہے۔"

"میرے بیٹے ان باتوں کو سمجھنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اس دنیا میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں کی گنتی ہو جاتی ہے مگر آدمی اپنے لہو کی بوند کا حساب نہیں رکھتا۔ ایسے ہی لہو کے چھینٹے اس آشرم میں آتے ہیں۔ اگر مرد اپنے پاپ (گناہ) سے انکار نہ کرے تو کوئی عورت اپنے بچے کو یہاں نہ لائے اب اگر میں بولتا جاؤں تو بات بہت دور تک جائے گی۔"

"آپ مجھے ٹالنے کیلئے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"بیٹے جو سچ تھا وہ میں نے کہہ دیا۔"

"نہیں شریمان! میں بچہ نہیں ہوں کہ بہل جاؤں۔ میریا نے عورت ذات کی لاج رکھنے کی پرارتھنا کی ہوگی۔ اسی لئے آپ مجھے اس بچے کی ماں کا نام اور پتہ نہیں بتائیں گے لیکن میں ہار ماننے والا آدمی نہیں ہوں۔ جب یہ خبر میرے اخبار میں چھپے گی کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو بچہ ہے وہ پندرہ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اور جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے مہیش چندر اور ان کی پتنی کی گود میں پہنچا تھا تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟ وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں۔ اس بچے کی اصل ماں جہاں بھی ہوگی، وہ اخبار پڑھتے ہی سات پردوں سے نکل کر اپنے بچے کی طرف بھاگے گی ــــ اونہہ، میرا نام داس دیو ہے۔ داس دیو...."

وہ بڑے گھمنڈ سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میریا نے مایوسی سے کہا۔

"یہ نہیں مانے گا۔ اس کی نادانی سے ان دو ماؤں تک یہ خبر پہنچ جائے گی۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ان کے دلوں پر کیا گذرے گی۔ میرے اندر تو ایسی تڑپ اور بے چینی ہے

کرمیں پنکھ لگا کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہتی ہوں۔"

" دھیرج رکھو بیٹی! بھگوان سے بچے کے لئے پرارتھنا کرو۔ ہم تین عورتوں کی لاج بھی رکھے گا۔ پتہ نہیں وہ دو عورتیں کہاں ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر چھوڑ دیا تھا یعنی اپنے آپ کو چھپا لیا تھا مگر اب بچے کی پیاس کر وہ چھپی نہ رہ سکے گی۔"

" دوسری کو میں پہچانتی ہوں۔ اس کا نام یشورانی ہے ..."

*

یشورانی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہوئی خلاء میں ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یہ انسان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلاء میں گھورنے لگتا ہے اسی طرح یشورانی خلاء میں گھورتی ہوئی جیل کی آہنی سلاخوں سے نکل کر ماضی کے اس دور میں پہنچ گئی تھی جب وہ کنواری کنیا کہلاتی تھی۔

ماتا پتا نے اس کا نام یشودھا رکھا تھا۔ بھگوان کرشن کنہیا کو جنم دینے والی ناری کا نام بھی یشودھا تھا۔ اس ناطے سے یشورانی کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو پوتر اور بھاگوان بنانے کے لئے اس کا نام یشودھا رکھا۔ لیکن جب وہ پنگھٹ پر پانی بھرنے کے لئے جانے لگی تو ایک دن بستی کے ایک شریر نوجوان نے غلیل چلا کر پانی سے بھری ہوئی اس کی گاگر گرادی۔ یشودھا نے غصہ سے کہا۔

" تو نے گاگر توڑ دی، پانی گرا دیا، ساڑھی بھگو دی۔ مجھے ستا کے تجھے کیا ملا؟"

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ " کرشن کنہائی بھی اپنی رادھا کو اس طرح ستایا کرتے تھے۔"

" مگر میں رادھا نہیں ہوں۔ میرا نام یشودھا ہے۔"

" کسی ماں کا نام یشودھا ہو تو اچھا لگتا ہے تیرے جیسی جوان، چنچل اور البیلی ناری صرف رادھا کے روپ میں اچھی لگتی ہے۔"

یہ بات یشودھا کے من میں بیٹھ گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ دنیا کی جوان آنکھوں میں سمانے کے لئے جوان ہو گئی ہے اس رات وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نوجوان کی نگاہوں کی گرمی کبھی اس کا یہ پہلو اور کبھی وہ پہلو جلاتی رہی۔ دوسرے دن پنگھٹ پر نوجوان نے کہا۔

" میرا نام مرلی دھر ہے۔ آج رات جب چاند ڈوب جائے گا تو میں تیرے مکان کے پچھواڑے کھلیان میں انتظار کروں گا۔"

اس کی ہر بات انگارے کی طرح چور جذبوں کو چھو لیتی تھی رات آئی تو وہ اپنے جذبات سے لڑنے لگی کہ کھلیان میں نہیں جائے گی یہ بُری بات ہے واقعی یہ باتیں بری ہوتی ہیں کوئی بھی سیدھی سادی شرمیلی سی لڑکی خود کبھی بے شرمی کی طرف نہیں جاتی۔ جوانی کا مقناطیس جبراً اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اس کنواری نے سوچا۔

رادھا بھی شیام سانورے سے ملنے جاتی تھی۔ اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو بھگوان خود کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کی مرلی کی تان سمجھاتی ہے کہ پریم جادو ہے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ پریم ایسی شکتی ہے جو رادھا کرشن کے روپ میں پوجی جاتی ہے۔"

جب چاند ڈوب گیا تو کھلیان میں یشودھا کا حسن طلوع ہو گیا۔ دنیا کے تمام ماں باپ اپنی جوان بیٹیوں کے آگے لچھمن ریکھا کھینچتے ہیں کہ بیٹیاں اس حیا اور حفاظت کی لکیر سے باہر قدم نہ نکالیں لیکن پریم شکتی اسے کھینچ کر لے گئی تھی اس سے یشودھا نے یہ نہیں سوچا کہ پریم اور پاپ کے بیچ ناخن برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ جادو نا میں ڈوب کر یہ فاصلہ کیسے ختم ہو جاتا ہے، یہ پتہ نہیں چلتا۔ پھر بھی وہ بڑی سہمی ہوئی تھی۔ مرلی دھر نے فاصلے کو پاٹنا چاہا تو وہ کترا گئی۔

" نہیں مرلی! اگر تم بیاہ سے پہلے مجھے ہاتھ بھی لگاؤ گے تو میں اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔ تم میرے من میں سما گئے ہو۔ اس لئے چلی آئی میرے اس طرح آنے کی لاج رکھ لو۔"

مرلی دھر نے سمجھ لیا کہ دال نہیں گلے گی۔ اس نے پوچھا۔

"پھر ہم کس طرح ایک ہوں گے تیرا باپ اونچی ذات کا برہمن ہے اور میں ذات کا کھتری ہوں۔ ہماری شادی نہیں ہو سکے گی کیا میں سارا جیون تجھے دیکھتا اور ۔۔۔۔ ترستا رہوں گا؟"

اس نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا ایسے جذباتی لمحوں میں وہ انکار نہ کر سکی ہولے ہولے کانپنے لگی پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ کوئی ہاتھ پکڑے تو عورت ساری کی ساری پکڑ میں آجاتی ہے مرلی دھر نے اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"وچن دو کہ مجھ سے شادی کرو گی۔ ہم مندر میں جا کر بھگوان کے سامنے ایک ہو جائیں گے۔ پھر ہمارے بیچ ذات پات کی کوئی دیوار نہ ہوگی"

"ہم یہ سوچ کر بتاؤں گی" وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔

وہ دو دن کشمکش و پیچ میں مبتلا رہی بوڑھے ماتا پتا کی بدنامی سے ڈرتی رہی۔ لیکن جذبات کے ترازو میں بڑھاپے کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ جوانی کا پلڑا ہمیشہ بھاری پڑتا ہے تیسرے دن وہ پوجا کے لئے مندر گئی وہاں لگن منڈپ نہیں تھا۔ اس نے ہونے والے پتی کے ساتھ سات پھیرے نہیں لگائے صرف بھگوان کو شاکشت مان کر مرلی دھر کو اپنا پتی مان لیا۔

اس کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ مرلی دھر کے ساتھ کتنی مضبوط زنجیر میں بندھ گئی ہے اب اسے پتی سمجھ کر اس کی آگیا کا پالن کرنا اس کا دھرم ہو گیا تھا۔ ایک رات مرلی دھر نے کہا۔

"ہم کب تک چوری چوری کھیتوں میں ملتے رہیں گے میری بات مانو یہاں سے بمبئی شہر چلو۔ میں پورا بمبئی گھوم آیا ہوں۔ تم اتنی سندر ہو کہ فلم کمپنی میں تمہیں کام مل جائے گا۔ یہاں ہولی کے تہوار میں تم نے رادھا کا جو سوانگ رچایا تھا۔ اسے دیکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کامیاب ہیروئن بن جاؤ گی۔ پھر ہمارے پاس اتنی دولت ہوگی کہ تم اس کا حساب نہیں کر سکو گی"

وہ ہر رات اسے سبز باغ دکھانے لگا۔ کچھ سپنوں کی رنگینیاں تھیں اور کچھ اپنے پتی کا حکم تھا کہ بمبئی چلے۔ یہاں رہے گی تو ماں باپ زبردستی دوسری جگہ شادی کر دیں گے لہٰذا وہ مرلی دھر کے ساتھ بمبئی پہنچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے حد حسین تھی بہار سے نقوش ایسے تیکھے اور ایسے جاذب نظر تھے کہ نظریں جذب ہو کر رہ جاتی تھیں۔ یہ بھارت پروڈکشنز کے مالک پنا لال نے اسے دیکھا تو منہ سے رال ٹپک گئی۔ وہ مرلی دھر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر دیر تک باتیں کرتا رہا پھر مرلی دھر نے واپس آ کر خوشخبری سنائی۔

"یشودھا! تم بہت لکی ہو سیٹھ پنا لال تمہیں اپنی فلم میں ہیروئن کا رول دے رہے ہیں اب تم ایک بہت خوبصورت کوٹھی میں رہو گی۔ تمہارے پاس کار ہو گی۔ نوکر ہوں گے۔ پنا لال کی پانچ فلموں میں کام کرنے تک تمہیں ہر ماہ بیس ہزار روپے ملیں گے"

یشودھا حیرانی سے سنتی رہی کہ یہ سپنے کس طرح سچ ہو رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر مرلی دھر کے ساتھ اپنی کوٹھی میں آ گئی۔ اس کوٹھی کا ایک کمرہ فلم کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی بہانے پنا لال بھی صبح سے رات گئے تک وہاں رہتا تھا اور یشودھا سے فلمی رول کی ریہرسل کراتا تھا۔ ریہرسل کے دوران مرلی دھر باہر چلا جاتا تھا۔ کیونکہ پنا لال کا اعتراض تھا کہ وہ اپنے پتی کے سامنے جھجکتی اور شرماتی ہے۔

پنا لال اسے سمجھانے لگا کہ اگر وہ تنہائی میں شرمائے گی تو کیمرے کے سامنے کام نہیں کر سکے گی مگر شرم تو ایک فطری جذبہ ہے وہ بعض اوقات جھنجھلا کر سوچتی کہ ایسا کام نہیں کرے گی۔ لیکن پانچ سال کا ایگریمنٹ ہو چکا تھا مرلی دھر نے کہا۔

"تم کام چھوڑ دو گی تو پنا لال کا لاکھوں روپے کا نقصان ہوگا وہ تمہیں جیل تک پہنچا دے گا ذرا عقل سے کام لو۔ جیل میں جانے کے بدلے عزت اور شہرت حاصل کر لو"

پانچ سال کے ایگریمنٹ نے اسے مجبور کر دیا تھا اور مجبوری کے وقت عقل سے

کام لینا پڑتا ہے اس لئے وہ مُرلی دھر کی عقل کے مطابق کام کرنے لگی۔ ایک ماہ بعد فلم کے ایک ایسے سین کا ریہرسل تھا جس میں ولین ہیروئن کو دھوکے سے شراب پلا کر اس کی عزت لوٹ لیتا ہے پنّا لال نے اسے سمجھایا کہ اب اسے ایک گلاس میں شربت پلایا جائے گا اور وہ پینے کے بعد ایسی ایکٹنگ کرے گی جیسے سچ مچ شراب پی لی ہو یشودھا نے کہا۔

"میں ایک شرابی عورت کی ایکٹنگ کیسے کروں گی۔ میں کیا جانوں کہ شراب پی کر کیسا لگتا ہے"

"تم فکر نہ کرو" پنّا لال نے کہا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ تم سب کچھ سیکھ جاؤ گی شراب تو معمولی سی چیز ہے۔ تم زہر پی کر بھی مرنے کی کامیاب اداکاری دکھا سکو گی۔ چلو اب اس گلاس کے شربت کو ایک سانس میں پی جاؤ"

یشودھا نے گلاس کو اٹھایا۔ مگر چند گھونٹ پینے کے بعد اُسے اُبکائی سی آنے لگی۔ حلق جلنے لگا۔ پنّا لال نے ذرا جلدی سے کہا۔

"شربت کو میں نے جان بوجھ کر ذرا کڑوا رکھا ہے تاکہ تم خود کو سچ مچ شراب پیتی ہوئی محسوس کرو۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ ایک سانس میں پی جاؤ"

شراب ہو یا زہر، پہلی بار پیتے وقت ایک سانس کی مدت بھی بہت ہوتی ہے۔ دوسری سانس میں گلاس خالی ہو گیا مگر سر میں آندھیاں سما گئیں۔ ساری دنیا اس کے چاروں طرف گھومنے لگی۔ اس وقت جو کچھ اُس پر گزر رہی تھی، اسے وہ فلم کا سین سمجھ رہی تھی کیونکہ زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فلموں میں دھرایا جاتا ہے اور فلموں کے ذریعہ جو کچھ سکھایا جاتا ہے زندگی میں اس کی سچی ریہرسل ہوتی ہے۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ شام مرلی دھر آیا تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ کر روتے ہوئے صاف صاف کہنے لگی۔

"اب میں آپ کے قابل نہیں رہی۔ جس پنّا لال کو تم دیوتا کہتے تھے، اس نے دیو بن کر مجھے مسل ڈالا ہے۔ میں آپ سے مارے شرم کے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ میں مر جاؤں گی"

مرلی دھر نے اسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

"میری جان! اتنی ذرا سی بات پر رو رہی ہو پہلے ہی چانس میں پانچ فلموں کی ہیروئن بننے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے......"

یشودھا نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مُرلی دھر یہ بات سنتے ہی غیرت کے جوش میں پنّا لال کو قتل کر دے گا۔ یا پھر اپنی دھرم پتنی کا ہاتھ تھام کر ساری دولت اور جھوٹی عزت و شہرت کو ٹھوکریں مار کر اُسے گاؤں واپس لے جائے گا لیکن اپنے پتی کی بے غیرتی دیکھ کر جیسے ایک جھٹکے سے اُسے عقل آ گئی کہ وہ اس کا پتی کب تھا؟ لگن کہاں ہوا تھا؟ اس بھگوان کے سامنے جو پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اگر اس پتھر کے سینے میں دل ہوتا تو وہ اسے ٹھوکریں کھانے سے پہلے ہی بچا لیتا۔ مگر یہ بے غیرتی اوپر سے نیچے تک ہے۔ بھگوان نے بڑی خاموشی سے اسے مُرلی دھر کی بے غیرت جھولی میں ڈالا۔ مرلی دھر نے اسی طرح پنّا لال کی گود میں اُسے ڈال دیا۔ ایسے وقت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ بھگوان اور انسان دونوں کا عمل ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟

اس روز وہ مُرلی دھر سے کچھ نہ بولی۔ من ہی من میں کڑھتی رہی۔ دوسرے دن پنّا لال آیا تو وہ بولی۔

"سیٹھ صاحب! اگریمنٹ کس سے ہوا ہے؟"

"تم سے......"

"آپ ہر ماہ بیس ہزار روپے کس کے ہاتھ میں رکھیں گے؟"

"تمہارے ہاتھ میں......"

"یہ کوٹھی اور کار کس کی ہے؟"

"وہ تمہاری ہے میری جان!"

"جب میں تمہاری جان ہوں تو یہ دلال اس کوٹھی میں کیوں رہتا ہے اسے دھکے مار کر نکال دو۔"

یشودھا نے نفرت سے مرلی دھر کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"یشودھا یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو کہ تم نے اپنے پتی کا اپمان (توہین) کیا ہے؟"

"میں ابھی ہوش میں آئی ہوں۔ تم میرے پتی کب تھے؟ اور تم کیا جانو کہ پتی کا کرتویہ ہوتا ہے؟ ارے بے شرم! مرد وہ ہوتا ہے جو ایک ہاتھ سے اپنی عورت کا ہاتھ پکڑتا ہے اور دوسرا اٹھا کر اس کے لیئے ساری دنیا سے لڑتا ہے مگر تم دلال ہو دفع ہو جاؤ میرے گھر سے — جب میں محنت کرتی ہوں، میں کماتی ہوں، میں اپنی پرورش آپ کرتی ہوں۔ سب کچھ میں ہی کرتی ہوں تو پھر تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ میں ایک کتے کو پال سکتی ہوں تمہیں نہیں پال سکتی۔ سیٹھ پنالال اگر مجھ سے دوستی رکھنا چاہتے ہو تو اس بے غیرت کو ابھی یہاں سے نکال دو۔"

یشودھا کے اس حکم کے بعد مرلی دھر دودھ کی مکھی بن گیا۔ پنالال کے آدمیوں نے اسے چٹکی سے پکڑ کر کوٹھی سے باہر پھینک دیا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد فلم کی پبلسٹی شروع ہوئی تو پنالال نے کہا۔

"یہ یشودھا جیسا نام بہت پرانا ہے تمہارا کوئی ماڈرن قسم کا نام ہونا چاہیئے۔"

یشودھا نے کہا۔

"ہاں یشودھا بہت ہی پوتر (مقدس) نام ہے میرے ماتا پتا اس نام کے سائے میں مجھے ایک شریف لڑکی بنانا چاہتے تھے۔ آہ۔ میرے بھاگ (نصیب) میں یہ دن لکھے تھے چلو اب کوئی بدمعاش قسم کا نام رکھ دو۔"

پنالال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب تم زہریلی باتیں کرنا سیکھ گئی ہو۔ اب تمہاری اداکاری میں نکھار آ جائے گا۔ میرا خیال ہے تمہارا نام رانی ہونا چاہیئے تم فلم دیکھنے والوں کے دلوں پر راج کرو گی۔"

"صرف رانی نہیں، میرے اپنے نام کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ میں اپنے آپ کو یاد رکھ سکوں۔ یشو رانی کیسا نام ہو گا۔"

"بہت خوبصورت۔ بس آج سے تمہارا نام یہی ہے۔"

یشو رانی اپنے نام کے ساتھ ساتھ بدل گئی۔ دو ماہ بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ آٹھ ماہ کے بعد وہ فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوئی تو دیس کے کونے کونے میں یشو رانی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ تمام کروڑ پتی فلم ساز اس کے دروازے پر آنے لگے لیکن وہ پانچ سال تک پنالال کی پابند تھی پنالال اب اسے ہر ماہ ایک لاکھ روپے دے رہا تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ دوسری فلم مکمل ہوتے ہی اس سے شادی کرے گا۔ اگرچہ اب پنالال سے بھی زیادہ دولت مند لوگ اس سے شادی کی تمنا کرتے تھے لیکن یشو رانی نے سوچا کہ جو اس کی عزت تک پہنچ چکا ہے اسی ایک مرد کی ہو کر رہے تو بہتر ہے اس لئے وہ دوسری فلم کے ریلیز ہونے تک پھر ایک ازدواجی اور گھریلو زندگی کے خواب دیکھنے لگی۔

دوسری فلم ریلیز ہوئی مگر باکس آفس پر کامیاب نہ ہوئی۔ ایسے ہی وقت یشو رانی کو پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے اس نے فون پر پنالال کو اطلاع دی کہ فوراً ہی شادی کرو۔ ورنہ ہمارا بچہ ناجائز کہلائے گا۔ پنالال فلم کی ناکامی کے باعث سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جھلا کر جواب دیا۔

"میرے ایک کروڑ روپے ڈوب رہے ہیں اور تمہیں شادی اور رنگ رلیوں کی سوجھ رہی ہے۔ ابھی میرے ساتھ بکواس نہ کرو۔"

یشو رانی نے غصے سے کہا۔

"تم بکواس نہ کرو جب میں ڈوب رہی ہوں تو تمہارے ڈوبنے کی پروا نہیں کروں گی ہمارے ہونے والے بچے کو بدنامی سے بچاؤ۔ نہیں تو میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔"

پنالال نرم پڑ گیا۔ کیونکہ یشو رانی اب پہلے جیسی کمزور اور بے سہارا عورت نہیں تھی کتنے ہی دولت مند ہاتھ اسے سہلا دینے کے لئے تیار تھے ایک مشہور فلمی ہیرو چندر شیکھر اس سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا۔ پنالال نے شیکھر سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا۔

"میں یشو رانی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسے اپناؤ گے؟"

شیکھر نے ایک دم سے خوش ہو کر کہا۔

"میں دل و جان سے اُسے اپناؤں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی حسین عورت کو میری خاطر چھوڑ دو گے۔"

"یقین کرو۔ میری دو شرطیں مان کر تم اسے حاصل کر سکتے ہو پہلی شرط یہ ہے کہ تمہیں کل ہی یشو رانی سے بیاہ کرنا ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم میری اگلی فلم میں کام کرنے کا معاوضہ نہیں لو گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"تو پھر جاؤ، اور یشو رانی کو یہ خوشخبری خود ہی سنا دو کہ تم اس سے بیاہ کر کے اس کے ہونے والے بچے کے باپ بن جاؤ گے۔"

"کیا مطلب؟" شیکھر نے چونک کر پوچھا۔

"کیا تم اسے اس جرم کی وجہ سے چھوڑ رہے ہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟ یہ تو بڑا ہی کمینہ پن ہے۔"

"شیکھر! میں فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا آخری فیصلہ سنا دو۔ میری دو شرطیں منظور کرتے ہو یا نہیں؟"

"میں یشو رانی سے سچی محبت کرتا ہوں ۔۔۔ اس سے ہر حال میں شادی کروں گا۔"

وہ بڑے عزم سے یشو رانی کے پاس چلا گیا۔ پنالال اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا اس کا خیال تھا کہ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے یشو رانی کو بھی فوری طور پر اپنے بچے کیلئے ایک باپ کی ضرورت ہے لہٰذا وہ شیکھر کو قبول کرے گی لیکن رات کے دس بجے ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ یشو رانی ملنے آئی ہے۔

پنالال نے کہا۔

"جا کر کہہ دو سیٹھ صاحب گھر میں نہیں ہیں کل آ کر ملاقات کرے۔"

ملازم چلا گیا۔ پنالال ڈر گیا تھا کہ وہ ہنگامہ کرنے آئی تھی اور آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دنوں کیلئے بمبئی چھوڑ دے گا۔ جب وہ ہار کر شیکھر سے شادی کرے گی تو پھر واپس آ جائے گا۔ ملازم نے واپس آ کر بتایا کہ یشو رانی واپس چلی گئی ہے اسے اطمینان ہو گیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں سونے کے لئے گیا تو وہ بلا وہاں موجود تھی۔ پنالال نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

"کیا اس بیڈ روم میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے، آرام سے بیٹھو۔"

"میں بیٹھنے نہیں، ہمارے تمہارے پچھلے گناہوں کا حساب کرنے آئی ہوں۔ ہوس کے غلام کیا تم اس دن کے لئے مجھے محبت کا فریب دے رہے تھے تم لوگ اتنی بے شرمی کے بعد بھی مرد کیسے کہلاتے مرلی دھر نے مجھے تمہارے حوالے کیا اور اب تم مجھے شیکھر کے حوالے کر رہے ہو کیا اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے ہو۔"

"دیکھو یشو رانی! جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ میں خاندانی آدمی ہوں۔ تم فلموں میں ناچنے والی عورت ہو اگر میں تم سے شادی کروں گا تو برادری والوں سے سارے ناطے ٹوٹ جائیں گے۔"

دوسری فلم میں میری رقم ڈوب گئی ہے۔ تیسری فلم کے لئے میرا باپ مجھے رقم نہیں دے گا ہم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم صفر پروڈیوسر اور ہیروئن کے ناطے سے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ شیکھر جیسا ہیرو تمہارا جیون ساتھی بننا چاہتا ہے۔"

"شیکھر آدمی نہیں دیوتا ہے سچی محبت اسے کہتے ہیں وہ میرا پتی اور بچے کا پتا بن کر میرے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ میں ایسے مرد کو بھگوان بنا کر پوجتی رہوں تو بھی کم ہے مگر ابھی تو میں تم سے نمٹنے آئی ہوں۔ میری عزت اتنی سستی نہیں ہے کہ تم لوگ مجھے پرشاد (پوجا کی مٹھائی) کی طرح دوسروں میں بانٹتے رہو۔ مرلی دھر بچ کر نکل گیا ہے مگر تم زندہ نہیں بچو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے پیتل کا گلدان اٹھا کر اس پر حملہ کیا۔ پہلی بار تو وہ بچ گیا۔ دوسری بار اپنی دھوتی سنبھالتے سنبھالتے مار کھا گیا۔ یشورانی کے اندر لاوا پک رہا تھا۔ غصہ اور جنون میں وہ اس کے سر پر گلدان سے ضربیں لگاتی رہی۔ پھر اس وقت ہوش آیا جب پنالال خون میں لت پت ہو کر فرش پر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

یشورانی دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایک انسان کی جان لی ہے ایسے وقت اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا اگر وہ جیل جائے گی تو اس معصوم بچے کا کیا بنے گا۔ جب اس نے ماں بن کر سوچا تو عقل آ گئی۔ اس نے پیتل کے گلدان کو ساڑھی کے آنچل سے صاف کیا۔ پھر کھڑکی کے راستے باہر جاتے وقت بھی ان تمام جگہوں کو پونچھتی چلی گئی جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جا سکتے تھے۔

اتنی احتیاط کے باوجود دوسری صبح پولیس اس کے دروازے پر پہنچ گئی۔ قانون کے ہاتھ اسے حوالات میں لے گئے پھر حوالات سے کچہری اور کچہری سے جیل میں لے گئے

مقدمہ چلنے کے دوران بڑے بڑے فلم ساز اسے سزا سے بچانے کی کوشش کرتے رہے شیکھر اکثر اس سے ملنے آتا تھا اور اسے تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ پنالال کے ملازم کی گواہی نے اسے جیل میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن گواہ نے یہ بھی کہا تھا کہ جب پنالال نے ملاقات سے انکار کر دیا تو یشورانی واپس چلی گئی تھی۔ پنالال کا ______ باپ یشو سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ اس لئے اسے سزائے موت دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

مقدمہ کے دوران مہینے گزرتے رہے۔ زچگی کا وقت قریب آ گیا۔ ان دنوں مقدمہ اس کے خلاف جا رہا تھا اور وہ سوچتی رہتی تھی کہ اگر اسے پھانسی کی سزا ملے گی تو بچے کا کیا انجام ہو گا۔ جیلر اور دوسری قیدی عورتیں سمجھاتی تھیں کہ بچے کو کسی آشرم میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر نہیں چھوڑے گی تو پھانسی کا پھندہ اسے چھڑا دے گا۔

آخر وہی ہوا۔ پولیس ہسپتال کے میٹرنٹی ہوم میں بچے نے جنم لیا۔ ان دنوں وہ جھپائی گوڑی کی جیل میں منتقل کر دی گئی تھی اس طرح وہ بچہ جھپائی گوڑی کے آشرم میں پہنچ گیا۔

اب وہ جیل کی آہنی سلاخوں کو تھام کر خلاء میں گھور رہی تھی۔ یہ انسان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلاء میں گھورنے لگتا ہے مگر اب یشورانی ماضی کے بے نام خلاء سے واپس آ گئی تھی اور سوچ رہی تھی۔

"کیا مجھے پھانسی کی سزا ہو گی؟ نہیں، نہیں میں زندہ رہوں گی۔ جیل کی اس چار دیواری سے باہر جاؤں گی اور آشرم میں پہنچ کر اپنے بچے کو سینے سے لگا لوں گی اسے ہر قیمت پر آشرم سے حاصل کر لوں گی۔"

*

پندرہ ستمبر کی صبح طیارے کو حادثہ پیش آیا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تک ریڈیو کے ذریعہ یہ خبر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ایک مظلوم اور دہشت زدہ بچے کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ کوئی ایسا طبقہ نہیں

تھا جو بچے کی سلامتی کے لئے دعائیں نہ مانگ رہا ہو ۔ ملک کے کونے کونے سے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کو فون کرکے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اس بچے کے متعلق ایک ایک لمحے کی خبر نشر کی جائے ۔ لہذا ہر آدھے گھنٹے کے بعد ریڈیو کے ذریعہ یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ بچے کے سلسلے میں جیسے جیسے خبریں موصول ہوتی رہیں گی انہیں عوام تک پہنچایا جاتا رہے گا ۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ مر چکا ہوگا ۔ کچھ لوگ یہ سوچ کر کانپ جاتے تھے کہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ناسمجھ بچہ دوپہر کی دھوپ اور رات کی سردی کا مقابلہ کیسے کرے گا ؟ وہ حادثہ سے بچنے کے بعد رات کی تاریکی میں دہشت سے مر جائیگا

دوپہر کو ریڈیو سے یہ خبر سنائی گئی کہ ہیلی کاپٹر سے جانی کے لئے کھانے کا سامان اور کمبل وغیرہ پھینکے جا رہے ہیں ۔

آدھ گھنٹے کے بعد پھر یہ خبر سنائی گئی کہ پولیس ، اسکاوٹ اور فوجی نوجوان اس پہاڑی کے دامن میں کیمپ لگائے ہوئے ہیں ریڈیو محکمہ اطلاعات اور اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی وہاں پہنچ رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ فوری طور پر بجلی پہنچائی جا رہی ہے تاکہ رات کے وقت دور تک اس پہاڑی کو روشن رکھا جا سکے اس کے باوجود وہ بجلی کی روشنی جانی کی بلندی تک نہیں پہنچا سکتے تھے ۔

جیسے ساری خلقت نے حادثہ کی یہ خبر سن لی تھی ۔ صرف ایک بانو اس خبر سے بے خبر تھی وہ صبح سے کچھ نامعلوم سی بے چینی محسوس کر رہی تھی ۔ ریڈیو آن کرکے کوئی گیتوں بھرا پروگرام سننے کو دل نہیں چاہا ۔ اس لئے گھر کا ریڈیو خاموش پڑا رہا ۔ شام کو پانچ بجے سرتاج حسین فوجی جیپ میں بیٹھ کر آیا تو اس کے ہاتھوں میں شام کا اخبار تھا اس نے اخبار کو بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا ۔

" آج ریڈیو سنا تھا ؟ "

" نہیں ، میرے سر میں درد ہو رہا ہے "

" آج کی خبریں سن کر تمام انسانوں کے دل میں درد اٹھ رہا ہے ایک طیارہ پہاڑی چٹان سے ٹکرا گیا ہے "

" ہوائی جہاز کے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں یہ افسوس کی بات ہے مگر کوئی نئی بات تو نہیں ہے "

" نئی بات یہ ہے بانو کہ ایک پانچ برس کا بچہ زندہ بچ گیا ہے اور بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تنہا پڑا ہوا ہے "

بانو کا دل دھک سے رہ گیا ۔ پانچ برس کی گنتی کے ساتھ ہی اپنے بچے کی جدائی تڑپانے لگی ۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو دیکھا پہلے صفحہ پر جانی کی تصویر تھی بڑی ہی من موہنی دل میں اتر جانے والی تصویر تھی ۔ بانو نے سوچا وہ میرا بچہ بھی اتنا ہی بڑا ہوگا اور ایسا ہی معصوم اور خوبصورت ہوگا ..... "

سرتاج حسین نے کہا " ذرا گرما گرم چائے پلاؤ ۔ میں ابھی چلا جاؤں گا ۔ پہاڑی کے دامن میں میری ڈیوٹی ہے میرا خیال ہے بچے کو اتنی بلندی سے نیچے لانے تک ساری رات گذر جائے گی ۔ ساری رات جاگنا ہوگا "

یہ کہتے ہوئے اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا ۔ موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی ۔ اگر وہ اپنے ساتھ اخبار لے جاتی تو چائے تیار ہونے کے دوران وہ دھماکہ خیز معلومات حاصل کر سکتی تھی ۔ لیکن اخبار کی صرف ایک تصویر نے اسے دور ماضی میں پہنچا دیا تھا ۔

جب وہ ایک ٹرے پر چائے سے بھری ہوئی دو پیالیاں رکھ کر اپنے سرتاج کے پاس جانے لگی تو موسیقی کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی ۔ پھر اچانک ہی وہ آواز تھم گئی اور کسی مرد کی آواز سنائی دینے لگی ۔

"یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے چند منٹ کے لئے موسیقی کا پروگرام روک کر جانی کے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔ سامعین! وہ بدنصیب جانی جو اپنے مردہ ماں باپ کے قریب زندہ ہے وہ دراصل ایک لے پالک بچہ ہے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی تاریخ پیدائش ......"

بانو ایک دم سے ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پندرہ ستمبر کی تاریخ سن کر اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے کانپ رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز نے کہا۔

"اب ایک مقامی اخبار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سورگ باشی مہیش چندر چڑجی اور ان کی دھرم پتنی نے اس بچے کو جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے حاصل کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اصل ماں ......"

ایک زور کا دھماکہ ہوا، حالانکہ چائے کی پیالیاں گر کر ٹوٹنے سے دھماکہ نہیں ہوتا۔ سرتاج ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا بانو؟"

کیا ہوا؟ بانو کیسے بتاتے کہ کیا نہیں ہوا۔ ایک ننھا سا بچہ اس کے سینے پر لاتیں مار رہا تھا۔ "امی۔ امی! نانی جان نے مجھے جلپائی گوڑی کے بالک آشرم میں چھوڑا تھا"

وہ بچہ بانو کے دل کو اپنی ننھی مٹھیوں میں مسل رہا تھا۔ "امی۔ امی! آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھئے تقدیر نے بھی مجھے کہاں لے جا کر چھوڑ دیا ہے مجھے ایسی بلندی نہیں چاہئے۔ مجھے اپنی گود میں اتار لیں امی ......"

بانو نے ممتا سے بے قابو ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے کے اطراف یوں بھینچ لئے جیسے بچے کو نامعلوم بلندی سے اتار کر سینے سے لگا رہی ہو۔ ایسے وقت وہ بھول گئی تھی کہ اس کا سرتاج اس کے سامنے موجود ہے۔ یوں تو آس پاس کی اور بھی بہت ساری دنیا آباد تھی مگر اسے اپنے بچے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جس بچے کو اس نے جنم دیا تھا اور

جس کی صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اب اس بچے کے تصور کو جانی کی تصویر سے قائم کر رہی تھی۔

پھر وہ چونک گئی۔ سرتاج اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔ "بانو کچھ تو کہو۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ اب اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا کہ وہ صرف ایک بچے والی نہیں، ایک شوہر والی بھی ہے اور اپنے شوہر سے اس گمنام بچے کا وجود چھپاتی آئی ہے اب وہ کس طرح چھپا سکتی ہے؟ اگر اب بھی اپنی زبان بند رکھے گی تو بچے کے پاس کبھی نہیں پہنچ سکے گی اور اگر زبان کھولے گی تو سرتاج کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ وہ اب تک اسے دل و جان سے چاہتا رہا۔ اپنی محبوب بیوی کا جھوٹ اور فریب سامنے آئے گا تو جنون کی حد تک محبت کرنے والے شوہر کا ردِ عمل کیا ہو گا ہو سکتا ہے کہ وہ اس فریب کو برداشت نہ کرے اور اسے طلاق دے دے۔

وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف سرتاج کی رفاقت تھی، عزت آبرو اور خوشگوار ازدواجی زندگی تھی۔ دوسری طرف پانچ برس سے بچھڑے ہوئے لاپتہ بچے کا پیار اپنا پتہ بتا رہا تھا۔ اب وہ اپنے دامن میں طلاق نامہ اور بدنامیاں لے کر اپنی ممتا کی تسکین کر سکتی تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں فیصلہ کر لیا کہ سرتاج کو سینکڑوں بیویاں مل سکتی ہیں مگر ایک ماں نے دیر کر دی تو وہ بچہ پھر نہ مل سکے گا۔

سرتاج سمجھ رہا تھا کہ بانو کو کسی قسم کا ذہنی صدمہ پہنچا ہے اس نے تسلی دینے کے لئے اسے سینے سے لگایا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہو گئی۔ پھر رو رو کر کہنے لگی۔

"آپ مجھے سینے سے نہ لگائیں۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے"

"کیسا دھوکا؟"

"ہم۔ میں آپ کی بیوی بننے سے پہلے۔ اے۔ ایک مطلقہ عورت تھی۔ یہ حقیقت میں آپ سے چھپاتی رہی۔ اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں۔"

بانو نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ شاید اپنی شریک حیات کی بے حیائی پر ہنس رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں سپاہی ہوں، اور سپاہی کسی علاقہ کو فتح کرنے سے پہلے اس کے جغرافیائی حالات سے واقف ہو جاتا ہے میں نے بھی تمہیں اپنی منکوحہ بنانے سے پہلے معلومات حاصل کی تھیں۔ پتہ چلا کہ تم ماں بیٹی پہلے جلپائی گوڑی میں رہتی تھیں۔ وہاں جا کر مسلمانوں کے محلے میں پتہ چلا کہ آصف نام کے کسی شرابی جواری سے تمہاری شادی ہوئی تھی وہ تمہارا گھر لوٹ کر اور تمہیں طلاق دے کر چلا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ایک بچے کی ماں بننے والی تھیں۔ اب بتاؤ وہ بچہ پیدائش سے پہلے ضائع کر دیا گیا یا......"

"نہیں، نہیں۔ وہ زندہ ہے" وہ قدموں سے لپٹ کر روتی چیختی ہوئی بولی "آپ مجھے مار ڈالیں مگر میرے بچے کو پہاڑ کی اس خطرناک بلندی سے زندہ سلامت اتار کر لے آئیں۔"

سرتاج نے حیران ہو کر قدموں سے لپٹی ہوئی بانو کو دیکھا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہو گیا کہ جو بچہ پہاڑ کی بلندی پر ہے۔ اس کی ماں قدموں کی پستی پر بلک بلک کر رو رہی ہے اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتا رہی ہے کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب کس طرح فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک گئی تھی غنڈے نوزائیدہ بچوں کو نیزوں پر اچھال رہے تھے ان حالات میں بچے کو زندہ رکھنے کی خاطر آشرم میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

سرتاج نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں پورے تین سال سے انتظار کر رہا تھا کہ تم اپنی حقیقت بتاؤ گی۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ تم جھوٹی اور خود غرض ہو۔ صرف اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے تم نے مجھ سے شادی

ہے کبھی تنہائی کے لمحات میں تمہاری قربت اور محبت سے پتہ چلتا تھا کہ تم صرف مجھے چاہتی ہو۔ مگر اس چاہت کے دوران کوئی کانٹا سا کھٹکتا رہتا ہے اگر کوئی رقیب کانٹا بن کر سامنے آتا میں کبھی برداشت نہ کرتا۔ لیکن اب یہ سن کر اطمینان ہوا کہ ہماری محبت کے درمیان صرف ایک بچہ کھٹک رہا ہے اور ایک معصوم بچہ کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔"

بانو نے خوشی سے روتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ میری مدد کریں گے میرے لعل کو زندہ سلامت میری گود میں پہنچائیں گے۔"

"بانو! اس بچے کو صحیح سلامت پہاڑ کی چوٹی سے نیچے لانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے اب میں بھی ایک باپ بن کر اس بچے میں دلچسپی لوں گا۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ تم فوراً جلپائی گوڑی کے آشرم میں پہنچ کر یہ ثبوت حاصل کرو کہ وہ بچہ تمہارا ہے یعنی ہمارا......"

"او سرتاج! آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں آپ نے یہ کہہ کر مجھے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے کہ آپ میرے اس بچے کے باپ ہیں۔"

وہ اُس کے سینے پر سر رکھ کر خوشی سے رونے لگی۔

*

میریا جب پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو وہاں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہزاروں آنکھیں پہاڑ کی بلندی کی طرف اس عمودی چٹان پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ بچہ نظر نہیں آ سکتا تھا مگر ہزاروں دلوں میں ایک ہی مشترکہ حسرت تھی کہ وہ بخیریت نظر آ جائے اتنے بڑے ہجوم کو روکنے کے لئے دور تک موٹے موٹے رسے باندھ کر حد بندی کر دی گئی تھی۔ حد بندی کے اندر فوجی نوجوان کوہ پیماؤں کی مدد کر رہے تھے۔ پہاڑ پر چڑھنے کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ رسے کے چاروں طرف پولیس اور اسکاؤٹ کے

نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ حد بندی کے باہر ہوٹل کھل گئے تھے لوگوں کو رات گزارنے کے لئے فی چارپائی پانچ روپے کے حساب سے مہیا کی جارہی تھی۔ بستر، کمبل، گرم کپڑے دھوپ کے چشمے دوربین اور کھانے کی مختلف چیزیں فروخت ہو رہی تھیں ایک بچہ جبکہ زندگی اور موت کے درمیان اچھوتی بلندی پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی پستی میں خود غرض لوگ تجارت کر رہے تھے اور ایک گلاس پانی کی قیمت دس پیسے وصول کر رہے تھے۔

میریا اس ہجوم میں ادھر سے ادھر بھٹکتی ہوئی معلومات حاصل کر رہی تھی کہ بچے کو بحفاظت نیچے اتارنے کے لئے کیسے کیسے انتظامات کئے گئے ہیں وہاں جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ہیلی کوپٹر اس عمودی چٹان کے قریب نہیں جاسکتا تھا۔ پیراشوٹ کے ذریعے اُترنے میں خطرہ تھا کہ اترنے والا نہ جانے کس کھڈ میں جا گرے اس لئے دیس کے مشہور اور تجربہ کار کوہ پیما جیت سنگھ کی خدمات حاصل کی جارہی تھیں وہ اپنی ٹیم کے ساتھ اس خطرناک بلندی کو سر کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔ ایک اندازے کے مطابق وہ صبح تک اس بچے کو واپس لا سکتا تھا۔

میریا کے دل کی عجیب حالت تھی وہ جب بھی آنکھوں سے دوربین لگا کر بلندی کی طرف دیکھتی تو اس کا دل خوف اور مایوسی کی پستی میں ڈوبنے لگتا اور وہ ندامت سے سوچنے لگتی "میں ظالم ہوں میں نے اس معصوم کو اپنے وجود سے نوچ کر پھینک دیا اور اب میں اس کے لئے اندر ہی اندر مر رہی ہوں"

پھر وہ سوچنے لگی "وہ میرا ہی بچہ ہوگا۔ بلکہ میرے ہی جگر کا ٹکڑا ہے خدا کرے کہ دوسری دعویدار عورتیں یہاں نہ آئیں۔ میں ہزار بدنامیوں کے ساتھ اپنے لعل کو اپنے سینے سے لگا کر یہاں سے لے جاؤں گی"

اسے اپنے پیچھے واس دیو کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی آنکھوں سے دوربین لگائے کوہ پیماؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی سرچ

لائٹ دور پہاڑ کو روشن کر رہی تھیں واس دیو نے آنکھوں سے دوربین ہٹاتے ہوئے کہا۔
"میریا! تم نے آج شام کا ہمارا اخبار پڑھا ہوگا اس سے اندازہ لگا ؤ کہ ہم کتنی تیز رفتاری سے کام کرتے ہیں"

میریا نے کوئی جواب نہیں دیا پھر وہ کہنے لگا۔

"میں اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ ہمارا اخبار پڑھتے ...... ہی بچے کی ماں ضرور آئے گی مگر اتنے بڑے ہجوم میں صرف ایک عورت تم ہی نظر آرہی ہو"

میریا نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا "کیا میں بتاؤں کہ بچے کی ماں تمہارے سامنے کھڑی ہے؟ مگر نہیں، جب تک یہ راز ہے بہتر ہے ......"

اس ماں کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ پہلے بچے کا انجام دیکھ لینا چاہیے اگر وہ زندہ سلامت واپس آئے گا تو وہ کھل کر بچے کا دعویٰ کرے گی ورنہ بچے کے ساتھ ماں کے رشتے کو بھی دفن کر دے گی۔

اس کے سوچنے کے دوران واس دیو نے اچانک کہا۔

"آ گئی جس کا انتظار تھا، وہ آ گئی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہی اس بچے کی ماں ہے"

میریا نے گھوم کر دیکھا۔ بانو بھیڑ کو چیرتی ہوئی رستے کی طرف آرہی تھی۔ اس کا شلوار کرتا گرد آلود تھا۔ دوپٹہ ایک شانے سے ڈھلک کر اس کے قدموں سے الجھ رہا تھا چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یوں جنونی انداز میں پھیلی ہوئی تھیں جیسے دل کی تمام دھڑکنیں آنکھوں کی دہلیز پر آکر پکار رہی ہوں "میرے لعل رات ہو چکی ہے واپس آجاؤ، میں دروازہ بند کروں گی ......"

واس دیو نے کہا "اس کی اجڑی ہوئی حالت بتا رہی ہے کہ وہ بچے کی ماں ہے میں ابھی دھماکہ خیز معلومات حاصل کرتا ہوں۔ کل کا اخبار بھی ہاتھوں ہاتھ بکے گا"

بانو رستے کے پاس آئی۔ پھر ذرا جھک کر حد بندی لائن کے اندر جانے لگی۔

ایک پولیس آفیسر نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

“شریمتی جی! اندر آنا منع ہے آپ باہر چلی جائیں”

بانو نے ہانپتے ہوئے کہا “مجھے معلوم ہے تم سامنے سے ہٹ جاؤ گے۔ میں کیپٹن سراج حسین کی بیوی ہوں”

آفیسر فوراً ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ داس دیو بھی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ میریا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

“دل کیوں رک گئے؟ کیا فوجی کیپٹن کی بیوی نے تمہاری کھوپڑی میں دھماکہ کر دیا ہے؟”

داس دیو آنکھیں سکیڑ کر دور جاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر بولا۔

“تعجب ہے یہ تو حلیے سے کیپٹن کی بیوی نہیں، صرف ایک اجڑی ہوئی ماں نظر آتی ہے”

میریا بھی سنجیدگی سے بانو کے متعلق سوچنے لگی کہ ایک کیپٹن کی بیوی یہاں پریشان حال کیوں آئی ہے بچے سے اس کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے مگر یہ تو مسلمان ہے اور بچہ ہندوؤں کے آشرم سے آیا ہے کیا ایک مسلمان ماں اپنے بچے کو ایسے آشرم میں چھوڑ سکتی ہے۔

چھوڑنے کی بات آئی تو یہ یاد آیا کہ کوئی عورت اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ کیا وہ عورت یہی کیپٹن کی بیوی تھی؟ میریا سوچتے سوچتے تھک گئی اس لیے بھی تھک گئی کہ وہ بچے کو صرف اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ کسی دوسری عورت کو اس کا حقدار سمجھنے سے تکلیف پہنچتی تھی۔ وہ تھکن مٹانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ کی طرف چائے پینے چلی گئی داس دیو بھی اس کے ساتھ تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

“تم عورت ہو کیپٹن کی بیوی سے دوستی کر کے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہو”

میریا نے خشک لہجے میں کہا۔

“اگر میں کچھ معلومات حاصل کروں گی تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا”

“تم تو بے کار مجھے اپنا دشمن سمجھ رہی ہو اگر میں سچی خبریں شائع کرتا ہوں تو اس کے لیے

تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیئے”

“اگر سچی خبر سے کسی معصوم اور مظلوم کی زندگی تباہ ہوئی تو اُسے شائع کرنا اخلاقی جرم ہے”

“کیا اُس ناجائز بچے کو جنم دیتے وقت اس عورت کو اخلاقیات کا خیال نہیں آیا؟”

“تم کیا سمجھو گے کہ عورت کن حالات میں مجبور ہو جاتی ہے کس طرح محبت کے نام پر پگھل جاتی ہے؟ اور کس طرح دوسروں کی ہمدردی میں لُٹ جاتی ہے؟”

وہ میریا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

“کیا تمہارا اپنا ایسا کوئی تجربہ ہے؟”

وہ چائے کا آخری گھونٹ پی کر جلدی سے اُٹھ گئی۔ داس دیو نے اس کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی مگر وہ بھی باز آنے والی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر دو پیالی چائے کے پیسے ادا کرتی ہوئی بولی

“یہ میری اور میرے اس بیٹے کی چائے کے پیسے ہیں”

پھر وہ داس دیو کی طرف پلٹ کر بولی۔

“میں کسی اخبار میں شائع نہیں کروں گی کہ تم میرے ناجائز بیٹے ہو”

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہوٹل کے باہر چلی گئی داس دیو چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔ پھر اُس نے غصّہ سے میریا کی جانب دیکھا۔ لیکن غصّہ دکھا سکا ٹھیک اسی وقت ایک بڑی سی ویگن کار ہوٹل کے قریب آکر رُکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک بہت مشہور پیر دشیکھر باہر آیا۔ پھر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ اس دروازے سے اس مجمع کی تیسری عورت باہر آرہی تھی۔

وہ سیاہ بارڈر کی سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ بلاؤز سے اُجلے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا تھا۔ ریشمی جوڑے کے پسِ منظر میں اس کا

حسین چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ گاڑی سے باہر آتے ہی اس کی آنکھیں پہاڑ کی تاریک چوٹی سے جا لگی تھیں۔ وہ آنکھیں اپنی زبانِ بے زبانی سے کہہ رہی تھیں۔

"میرے کرشن، میرے نندلال، میرے ماکھن چور تیری یشودھا میا آگئی ہے ایک عیاش نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں ماں بیٹے کے رشتے میں پُر دکر وہ سماج کو اور دھرم کو کتنی بڑی گالی دے رہا ہے یہ تو صرف ماں کا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی بڑی گالی کو بڑے پیار سے دودھ پلاتی ہے نیچے اُتر آ میرے لال! میری گود خالی ہے....."

داس دیو نے اسے دیکھتے ہی میریا کے قریب آکر کہا۔

"ارے یہ تو مشہور فلم اسٹار یشو رانی ہے میں نے سنا تھا کہ یہ کسی قتل کے کیس میں سزا کاٹ رہی تھی۔ اتنی مصروف اداکارہ ایک بچے کو دیکھنے یہاں آئی ہے یقین نہیں آتا کہ یہ بچے کی ماں ہو سکتی ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا یشو رانی کے پاس پہنچ گیا پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"میڈم! میں ایوننگ نیوز کا رپورٹر..... داس دیو ہوں آپ نے آج شام کے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ وہ بچہ لے پالک ہے یعنی اس کی اصل ماں اب بھی کہیں زندہ ہو گی مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں آئے گی۔ میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔"

یشو رانی چند لمحوں تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آپ اس کی ماں کو تلاش کر کے کیا کریں گے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میڈم! میں اس عورت کی تصویر اور اس کا بیان شائع کروں گا۔"

"کسی عورت اور ایک معصوم بچے پر کیچڑ اُچھال کر تم کتنے پیسے کما لو گے؟"

"اُں! ام۔ میں تو سچائی....."

وہ بات کاٹ کر بولی "سچائی کی بات نہ کرو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ

سچائی کی آبروریزی کس طرح ہوتی ہے۔" پھر اس نے شیکھر سے کہا۔

"شیکھر اس رپورٹر سے پوچھو کہ اس کے اخباری دفتر اور پریس کی قیمت کیا ہے یہ جتنے دام بتائے، اتنے نوٹ اس کے منہ میں ٹھونس کر منہ بند کر دو۔"

وہ اپنا پرس سنبھالتی ہوئی رستے کی طرف جانے لگی میریا تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ ہو گئی پھر اس سے بولی

"یشو رانی! میرا نام میریا ہے پہلے بھی ہمارا سامنا ہو چکا ہے شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

وہ رُک کر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔

"میرے اتنے پرستار ہیں کہ میں ہر ایک کا چہرہ یاد نہیں رکھ سکتی۔"

"میں تمہاری پرستار بن کر تمہارے سامنے نہیں آئی تھی آج سے پانچ برس پہلے پندرہ ستمبر کی صبح ہم دونوں آشرم میں موجود تھیں اور ہم دونوں ایک ہی اڈے سے وہاں گئی تھیں۔"

یشو رانی نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"اوہ میں سمجھ گئی۔ میں پنڈت گردھاری لال سے مل چکی ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس بچے کے تین دعویدار ہیں۔ ایک میں ہوں۔ دوسری تم نظر آرہی ہو۔ کیا یہاں تیسری بھی موجود ہے"

"ہاں، یہاں ایک عورت اور ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ تیسری دعویدار ہو گی بہتر ہے کہ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔"

"نہیں، پہلے میں اپنے بچے کی خبر لوں گی۔"

میریا نے تصحیح کی "یہ اپنا بچہ نہیں، ہمارا بچہ۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ وہ کس کا ہے اس وقت تک وہ ہم تینوں کا ہو گا۔"

یشو رانی کو اس کی بات بُری لگی۔ کیونکہ ممتا خود غرض ہوتی ہے اپنی گود کے بچے کو

دوسری گود سے منسوب نہیں کر سکتی۔ لیکن ممتا دوسری ماؤں کا درد بھی سمجھتی ہے یشودانی
کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الحال وہ تینوں کا مشترکہ بچّہ ہے۔

میریانے کہا۔ "صبح سے پہلے بچے کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا۔ کوہ پیما
اجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے جب تک کوئی نئی اطلاع ملے، ہم کہیں تنہائی
میں بیٹھ کر باتیں کریں گے"

یشودانی اس کے ساتھ اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ وہ بچّہ کس کا ہے؟"

"یہ میری سمجھ میں نہیں آتا — جب میں نے اپنے بچے کو جنم دیا تو اس وقت میں نیم
بے ہوشی کی حالت میں تھی میرے ایک ہمدرد سرجن نے مجھے اس بچے کی صورت نہیں دکھائی کہ
کہیں میری ممتا مچل نہ جائے۔ انہوں نے اسے آشرم میں پہنچا دیا۔ اگر میں اس کی صورت دیکھ بھی
لیتی تو کیا پانچ برس کے بعد وہ صورت سے پہچانا جا سکتا ہے؟"

"نہیں" یشودانی نے کہا۔ "میں نے اسے جنم دینے کے بعد دیکھا تھا۔ آج اخبار میں
اس کی تصویر بھی دیکھی۔ اب وہ پہچانا نہیں جاتا۔ پانچ برس میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں"

"کیا اس کے جسم پر کوئی واضح شناختی نشان تھا؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"اس بات کا میں نے خیال نہ رکھا۔ مجھے اس کی کوئی نشانی یاد رکھنی چاہیے تھی مگر میں
قتل کے مقدمہ اور بچے کے بچھڑنے کے خیال سے اس طرح دماغی پریشانی میں مبتلا رہی
کہ بچے کے کسی شناختی نشان کی طرف دھیان نہ دے سکی"

وہ بولتے بولتے سوچنے لگی "کاش کہ میں بچے کو آشرم میں نہ دیتی مگر وہ
لوگ مجھے یقین دلا چکے تھے کہ مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ان دنوں شیکھر بھی دیس سے
باہر شوٹنگ میں مصروف تھا ورنہ میں بچے کو اس کے حوالے کر دیتی۔ اور جب وہ واپس

آیا تو میری تقدیر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ عدالت نے یہ کہہ کر مجھے بری کر دیا کہ پنالال کے
ملازم نے مجھے پنالال سے ملاقات کئے بغیر واپس جاتے دیکھا تھا اس کے بعد دوبارہ
اس نے مجھے اس کوٹھی میں نہیں دیکھا اور نہ ہی جائے واردات پر میری موجودگی کا کوئی ثبوت
پایا گیا ہے محض شبہ کی بناء پر مجھے سزا نہیں دی جا سکتی۔

جیل سے رہا ہوتے ہی میں شیکھر کے ساتھ آشرم میں پہنچی تو ایک سال کا عرصہ گزر
چکا تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ اس آشرم میں کسی کے بچے کی شناخت
نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں وہ تحریری کاروائی نہیں کرتے ہیں۔ البتہ میرے یاد دلانے
پر پنڈت جی کو یاد آگیا کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے
تھے ......"

میریانے پوچھا "یشودانی کیا سوچ رہی ہو؟"

"آں" وہ چونک کر بولی "اپنے بچے کے لئے سوچ رہی ہوں۔ جواب ہوا
ہو گیا ہے"

اسی وقت ان دونوں نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ باہر تاریکی میں ایک عورت سائے کی
طرح نظر آرہی تھی۔ میریانے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

"تم کیپٹن سرتاج حسین کی شریک حیات ہو۔ اندر آجاؤ"

بانو نے گاڑی کے اندر آکر دروازے کو بند کیا۔ پھر ان کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"میرا نام بانو ہے۔ شاید میں اپنے بچے کی دو ماؤں سے مل رہی ہوں"

میریانے اس سے بھی کہا کہ وہ اپنا بچہ نہیں، ہمارا بچّہ کہے بانو نے انکار میں سر ہلاتے
ہوئے کہا۔

"جو بچّہ ازل سے میری کوکھ میں لکھ دیا گیا ہے میں اُسے آخری سانس تک اپنا کہوں
گی۔ تم دونوں بھی اُسے اپنا کہو گی تو میں اعتراض نہیں کر سکوں گی۔ سیدھی سی بات ہے وہ اپنا نہ

ہوتا اور اپنائیت نہ ہوتی تو ہم تینوں یہاں نہ آتیں "

یشو رانی نے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ اُسے اپنا کہتے وقت اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنا ہی ہے مگر اس طرح ہمارے درمیان جھگڑا پیدا ہوگا "

"ہاں۔ سمجھوتے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے "

"بچہ ممتا کے بازار میں تین ماؤں کے درمیان نیلام بھی نہیں ہوسکتا "

"اس کے لئے لاٹری کی پرچی بھی نہیں اُٹھائی جاسکتی "

"حضرت سلیمانؑ کے دربار میں دو عورتوں نے ایک بچے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہاں اصل ماں کے ساتھ انصاف ہوگیا تھا مگر ہم تین ماؤں کا فیصلہ کسی دربار میں نہیں ہوسکتا "

میریا نے کہا "خود غرضی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کے بل پر اُسے حاصل کریں۔ میرے پاس قلم کی طاقت ہے میں اپنے بچے کو حاصل کرنے کے لئے دیس کے سارے اخبارات کو جھنجھوڑ ڈالوں گی "

یشو رانی نے کہا "میں ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ چالیس لاکھ روپے لیتی ہوں اس وقت میرے پاس سات کروڑ کا بینک بیلنس اور دو کروڑ کی جائداد ہے میں اپنے بچے کے لئے آٹھ کروڑ روپے داؤ پر لگا دوں گی اور سب جانتے ہیں کہ روپے سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے "

بانو نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر یقین مستحکم سے کہا۔

"میرے پاس بھی بہت بڑی طاقت ہے اور وہ ہے خدا ....."

✻

رات پہاڑ بن گئی تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں وہ بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان کے پالنے میں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ اسی تشویش میں ماؤں کی نیند مر گئی تھی۔

میریا نے ہنستے ہوئے کہا "ہم سب پڑھی لکھی سمجھدار عورتیں ہیں ہمیں جاہلوں کے انداز میں ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کرنا چاہئے اگر ہم سہولت سے پُرسکون ہوکر سوچیں تو شاید کوئی حل نکل آئے "

بانو نے کہا "میرے خیال سے ہم تینوں اپنی اپنی داستان سنائیں اس طرح ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ جب ہمارا درد مشترک ہوگا تو ہم مشترکہ محبت کے جذبہ سے کوئی دانشمندانہ فیصلہ کرسکیں گے "

وہ راضی ہوگئیں۔ پھر [illegible] گزارنے کیلئے باری باری اپنی داستان سنانے لگیں پہلے میریا نے اپنی کتابِ زندگی کھولی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر جوانی کی ایک عام سی غلطی کر بیٹھی تھی اس کی داستان عام سی تھی مگر ممتا اپنی ذات میں خاص درجہ رکھتی ہے وہ بحالت مجبوری بچے کو جدا تو کرسکتی ہے لیکن اس کی محبت کو دل سے نوچ کر نہیں پھینک سکتی اس نے داستان کے آخر میں کہا۔

"میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ دنیا والے میرے بچے کو ناجائز کہیں۔ اور میں اپنا کیریر بھی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے بچے کو آشرم میں چھوڑ دیا ....."

یشو رانی نے اپنی داستان کے آخر میں کہا۔

"فلم کی ہیروئن کوئی اتنی نیک نام بھی نہیں ہوتی۔ میں بدنامیاں اٹھا کر بچے کو ضرور پالتی۔ مگر پھانسی پانے کے خیال سے میں اپنے بچے کو آشرم جیسی محفوظ جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئی "

بانو نے اپنی داستانِ حیات سنانے کے بعد کہا۔

"نہ مجھے بدنامی کا ڈر تھا اور نہ ہی کوئی میرے بچے پر انگلی اٹھا سکتا تھا۔ میں آخر وقت تک اپنی ماں سے لڑتی اور ضد کرتی رہی کہ بچہ میری گود میں پرورش پائے گا لیکن مذہب اور دھرم کی آڑ لے کر خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں نے میرے دل میں دہشت بٹھا دی کہ بچہ کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچایا گیا تو ظالم اُسے نیزوں پر اُچھالیں گے ....."

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھوڑی دیر کے لئے گاڑی کے اندر سناٹا چھا گیا
یہ سناٹا ان تینوں عورتوں کے اندر بھی تھا ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے کے بعد اب وہ
کسی کی گود سے بچے کو نہیں چھین سکتی تھیں۔ کیونکہ پرائی گود کا درد اب اپنا ہی درد تھا۔

صبح ہو رہی تھی۔ وہ تینوں آنسو پونچھتی ہوئی گاڑی سے باہر آ گئیں۔ بانو انہیں حد بندی
لائن کے اس پار لے گئی اور اپنے سرتاج سے بچے کی باقی دو ماؤں کا تعارف کرانے لگی
سرتاج حسین نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تم تینوں کو یہ خوشخبری سنا دوں کہ جیت سنگھ سے ٹرانسمیٹر پر گفتگو ہو چکی ہے
وہ بچے کو بحفاظت لے کر آ رہا ہے"۔

مارے خوشی کے ان تینوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بانو نے سرتاج کے بازو
سے لگ کر کہا "میرا بچہ!"

میریا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میرا بچہ!"

یشورانی پہاڑ کی بلندی کو نگاہوں سے چھو کر بولی "میرا بچہ!"

جب سے دنیا آباد ہوئی ہے "میرا اور تیرا" کا جھگڑا چل رہا ہے مگر وہ تینوں مائیں
اپنے اندر لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں اور یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ آپس کے جھگڑے
میں بچہ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جائے گا۔

وہ سوچتی رہیں اور بچے کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ حد بندی کے باہر ہزاروں
افراد بھی پہاڑ کی جانب تک رہے تھے۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد جیت سنگھ اپنی ٹیم کے
ساتھ بچے کو اپنی پشت پر باندھ کر صحیح سلامت نیچے آ گیا۔ وہ تینوں بے اختیار اس کی طرف
دوڑتی چلی گئیں اب بچے کو کمبل میں لپیٹ کر اسٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا تینوں مائیں اس
پر جھک گئیں وہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا اس کا چہرہ ایسا معصوم اور جاذب نظر تھا
کہ ماؤں کے دل اس کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا "آپ سب بچے کے پاس سے ہٹ جائیں اسے فوری طبی امداد کے
لئے ہسپتال پہنچانا ہوگا۔ پلیز......"

وہ تینوں ایک طرف ہو گئیں۔ حد بندی کے باہر کھڑے ہوئے داس دیو نے اپنی کھوپڑی کو
سہلاتے ہوئے سوچا "یہ تینوں کا معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے پچھلی رات یہ تینوں ایک ساتھ نظر
آ رہی تھیں اب اس میں شبہ نہیں رہا کہ ان میں سے کوئی اس بچے کی ماں ہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ
ان تینوں نے مل کر اس ایک بچے کو جنم دیا ہو......"

یشورانی، میریا اور بانو کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لئے پھر اسی گاڑی کی طرف
جانے لگیں۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر پنڈت گردھاری لال بیٹھے ہوئے تھے وہ
تینوں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے وہ اصل ماں کی نشاندہی کرنے آئے ہوں۔ انہوں نے کہا

"اندر آ کر دروازہ بند کرو۔ اور مجھے بتاؤ کہ تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔ میریا نے کہا۔

"ہم میں سے کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے آپ ہماری رہنمائی کریں"

"بیٹی! صرف اپنی ممتا کے لئے سوچو گی تو کبھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا تم تینوں کو صرف
بچے کی بھلائی کے لئے سوچنا چاہئے کیا تم تینوں نے بچے کو موت سے بچانے کے لئے آشرم
میں نہیں چھوڑا تھا؟"

یشورانی اور میریا نے تائید کی۔ بانو نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ بچہ میرے پاس عزت سے رہ سکتا تھا اور اب بھی اسے وہی عزت ملے
گی۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں اپنے بچے کو نیزے کی انی پر نہیں دیکھ سکتی تھی اس کی سلامتی کے لئے
اسے چھوڑ دیا تھا"

"تم ٹھیک کہتی ہو اب میں میریا اور یشورانی سے پر زور تقاضا کرتا ہوں کہ وہ بچے کو اس جگہ
رکھیں جہاں وہ ناجائز نہ کہلائے بانو کا بچہ جائز تھا جب ہی اسے بانو کے پاس رہنے

دو۔ تم کبھی کبھی بانو کے ہاں جا کر ایک ماں کی حسرتیں پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم دونوں نے میرے اس فیصلے سے انکار کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بچے کی عزت تمہیں پیاری نہیں ہے ....."

یہ کہہ کر پنڈت جی باہر چلے گئے میریا اور یشو رانی تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جب بانو ان کے قریب گئی تو وہ دونوں بانو کے سینے سے لگ کر رونے لگیں ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک معصوم بچے کی بدنامی کو ہمیشہ کے لئے دھو رہے تھے۔

باہر داس دیو نے پنڈت جی کو دیکھ کر کہا۔

"پنڈت جی! میں سب سمجھتا ہوں کہ اس گاڑی کے اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ سچی خبر میرے اخبار میں آ کر ہی رہے گی۔

"پنڈت گردھاری لال نے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

"میرے سچے صحافی بیٹے! ایک مسلمان عورت نے ہندو غنڈوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کیلئے اسے آشرم میں چھوڑ دیا تھا۔ کیا یہ سچی خبر تم ہمارے دیس کے کسی اخبار میں شائع کر سکو گے؟"

داس دیو کا لٹکا ہوا منہ بتا رہا تھا کہ ایسی سچی خبروں کو اخباری زبان میں پروپیگنڈا کہتے ہیں۔

کلی کا کفن

لوگو!
تم انتقامی جذبوں کو لہو کا کفن
اور پھول کے رشتوں کو خزاں کا کفن پہناتے ہو
اب آؤ
اور اس کلی کو ہوس کا کفن پہنا دو
تمہاری تہذیب مکمل ہو جائے گی۔

کبھی کبھی میری ٹیکسی دلہن کی طرح سنورتی ہے اور اس دلہن کی آغوش میں دولہا سہرا باندھ کر بیٹھ جاتا ہے آگے آگے بینڈ باجے والے فلمی دھن سناتے جاتے ہیں اور آگے پیچھے باراتی اور دولہا کے رشتے دار پانچ پیسے اور دس پیسے لٹاتے رہتے ہیں ایسے وقت یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی پچیس برس کی کنواری شمشاد کے لئے اس دنیا کے مہنگے بازار سے ایک دولہا خریدکرنے جارہا ہوں۔

بارات ہمارے محلے شریف آباد سے چلی تھی اور اورنگی ساڑھے گیارہ نمبر پر پہنچ کر رکی تھی، جہاں مصیبت کے مارے لوگ بنگلہ دیش سے آکر پناہ لے رہے تھے۔ بارات کے دولہا کا نام شریف احمد ہے۔ شریف احمد واقعی اسم بامسمیٰ ہے ہمارے محلے میں اس نے شرافت کی مثال قائم کی ہے۔ وہ کبھی نظریں اٹھاکر جوان لڑکیوں کو نہیں دیکھتا۔ میرے کچے مکان کے ٹھیک سامنے اس کا پکا مکان ہے۔ خود میری بہن شمشاد نے اس کی تعریف کی ہے کہ شریف احمد ہمیشہ اس کے سامنے سے سر جھکاکر گذر جاتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اس کی حد سے زیادہ شرافت مجھے کھٹکی پڑی ہے میں چاہتا تھا کہ وہ دوسروں کی نظریں بچاکر میری بہن کو دیکھے۔ مجھ سے چھپ کر میری بہن کی محبت میں گرفتار ہوجائے آپ مجھے بے غیرت کہیں گے اور زیادہ کہیں گے تو مجھے بہن کا دلال کہہ کر پکاریں گے مگر ایسا کہنے سے پہلے آپ کو میری غریبی اور میرے کچے مکان کو دیکھنا ہوگا۔ میری بہن کی بڑھتی ہوئی عمر کا حساب کرنا ہوگا۔ ان حالات میں لڑکی والے یہی چاہتے ہیں کہ کوئی لڑکا ان کی لڑکی کی خوبصورتی اور خوب سیرتی دیکھ کر پھنس جائے۔ اگر پھانسنے کے اس عمل کا نام دلال ہے تو ہم سب اس سوسائٹی کے مہذب دلال ہیں۔

شریف احمد کا باپ نعیم احمد بھی بہت زیادہ شریف اور غریب پرور ہے وہ اپنے بیٹے کے لئے کسی غریب لڑکی کو بہو بناکر لانا چاہتا تھا اور اکثر میری شمشاد کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ میں اس دھوکے میں رہا کہ وہ کسی دن میری بہن کا رشتہ مانگنے آئے گا مگر انہی دنوں بنگلہ دیش سے

مہاجرین کے قافلے آنے لگے ان کی مصیبتوں میں کام آنے کیلئے صاحب حیثیت لوگ روپے پیسے کی امداد کے علاوہ لٹے ہوئے خاندان کے افراد کو کہیں کام دھندے سے لگانے لگے اور کہیں ان کا گھر بسانے لگے۔ نعیم احمد بھی ایک مہاجر لڑکی کو اپنی بہو بنانے کیلئے بارات لے کر ان کی بستی میں پہنچ گئے۔

ہم سب کو مہاجروں سے ہمدردی ہے لہٰذا میں نعیم احمد سے یہ نہ پوچھ سکا کہ بندہ پرور، آپ میری بہن کی تعریفیں کیا کرتے تھے پھر ایک خانماں برباد لڑکی کی خانہ آبادی کیوں کررہے ہیں؟ ایسا پوچھتے وقت میں خود غرض کہلاتا اس لئے چپ چاپ شریف احمد کو دولہا بناکر اپنی ٹیکسی میں بٹھاکر اس لڑکی کے دروازے پر لے آیا جو میری بہن کی جگہ دلہن بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم ٹیکسی والے یوں تو اپنی مرضی کی سواری بٹھاتے ہیں لیکن پولیس والوں کے سامنے اور اپنے محلے والوں کے سامنے اپنی من مانی نہیں کرتے کیونکہ محلے میں ہمیں رہنا ہوتا ہے اور حوالات میں ہم رہنا نہیں چاہتے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں شریف احمد کی بارات کے ساتھ جانے سے انکار کردیتا لیکن میں ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا اور محلے کا باراتی بھی۔ اس لئے مجھے نکاح میں بھی شریک ہونا پڑا۔ مزید ستم یہ کہ نکاح پڑھانے والے قاضی صاحب نے مجھے قاضی بناکر دو وکیلوں کے ساتھ لڑکی کے پاس ایجاب و قبول کی گواہی کے لئے بھیج دیا۔

مجھے یہ اعزاز اس لئے حاصل ہوا کہ میں میٹرک پاس ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ انگریزی اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں اور اردو فصاحت و بلاغت سے بولتا ہوں۔ محلے والوں پر میرا اور میری بہن کا رعب طاری رہتا ہے کیونکہ وہ بھی ان دنوں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔

جب میں نکاح قبول کرانے عورتوں میں گیا تو وہ سانولی سلونی بنگالی دوشیزہ گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ بنگال کے حسن کا سلونا پن مشہور ہے میں اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا مگر خالی ہاتھوں کی نزاکت اور ملائمت بتارہی تھی کہ بڑا نمکین حسن ہے میں ابھی تک کنوارا ہوں مگر ٹیکسی کے ایک ایک پرزے کی طرح عورت کے کل پرزوں کو سمجھتا ہوں میری داستانِ حیات بتائے گی

کہ ایک تجربہ کار ٹیکسی ڈرائیور بننے کے لئے عورت کو سمجھنا کتنا ضروری ہے۔

جب تک میں اپنی بہن کو دلہن بنا کر رخصت نہ کرتا، اس وقت تک اپنے لئے دلہن نہیں لا سکتا تھا فی الحال ایک رات کی دلہنوں کے ساتھ نہایت شرافت سے زندگی گذار رہا تھا۔

اس وقت بھی اس سانولی سلونی لڑکی کو دلہن بنے دیکھ کر ٹیکسی کے میٹر کی طرح میرے دل کا بے ایمان میٹر بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اس سے نکاح قبول کرایا تھا۔ نکاح پڑھانے کے دوران صرف اتنا یاد ہے کہ اس دلہن کا نام زیب النساء عرف بیلا رانی تھا مجھے صرف بیلا رانی یاد رہ گئی۔

رخصتی کے وقت جب بیلا رانی کو سہرے کی لڑیوں میں چھپا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا تو میں نے عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا تاکہ تمام راستے اس کے سبکے نمکین ہاتھ مجھے نظر آتے رہیں۔ اگر اس وقت شریف احمد میری بہن کو دلہن بنا کر لے جا رہا ہوتا تو میں آئینے کی پوزیشن نہ بدلتا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے وقت انسان کو کبھی غیرت مند بنا دیتا ہے اور کبھی بے غیرت۔ ویسے بھی مجھ جیسا تجربہ کار کنوارا ہر عورت کو اپنی بہن تو نہیں بنا سکتا؟

میں نے بیلا رانی کو اس کے سہاگ کی پہلی منزل تک پہنچا دیا۔ شریف احمد اور اس کی ماں دلہن کو سہارا دے کر اپنے گھر میں لے گئے۔ اس گھر کے سامنے میرا گھر تھا۔ شمشاد کھڑکی سے لگی ایک لڑکی کو دلہن بن کر اپنی منزل تک پہنچتے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس وقت اس کی نگاہوں میں کتنی حسرتیں ہوں گی اور دل میں کتنے طوفان اٹھ رہے ہوں گے ایسے وقت میں اپنی بہن کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اس لئے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے دارو پینے چلا گیا۔

زندگی جب بہت زیادہ ٹھوکریں مارتی ہے تو شراب بھی پانی ہو جاتی ہے۔ سالا نشہ ہی نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو بہن کا اداس چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے غم غلط نہیں ہوتا۔ صبح ہو کر دماغ میں اک سکتہ چھا لیتا ہے۔ اس کی محرومیاں کہتی ہیں۔

”او میرے ٹیکسی ڈرائیور بھائی! تو ہر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے پھر بہن کو

راستے میں کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کتنے ہی مسافروں کو تو میٹر تیز کر کے پہنچاتا ہے مجھے بھی ایمانداری سے نہ سہی بے ایمانی سے ہی کہیں پہنچا دے۔ کسی کی دلہن بنا دے۔ اس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے تجھ سے کچھ نہیں ہوتا......“

میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ پہلے میں ایماندار تھا میٹر کے مطابق پیسے لیا کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایمانداری سے ٹیکسی چلا کر رئیس اعظم بن جاؤں گا۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ اس دنیا میں ایک کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ دو وقت کی روٹی کمانے کیلئے کسی نہ کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا پڑتا ہے اگر میں کسی سواری سے کہوں کہ میٹر سے چلنے میں میرا نقصان ہے ایک روپیہ زیادہ دو۔ وہ سیدھی طرح کبھی نہیں دے گا اسے میرے نقصان کی پروا نہیں ہوگی کیونکہ لوگ صرف اپنے فائدے پر نظر رکھتے ہیں پھر میں کیوں نہ اپنا فائدہ دیکھتا؟

اس لئے میں نے میٹر تیز کر دیا۔ ایمان کا میٹر بہت سست ہے کیونکہ ایمان کا حساب قیامت کے دن ہوگا۔ ابھی جس قیامت کا سامنا ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے، کھانے، کپڑے، مکان کا کرایہ اور تعلیم کے اخراجات کے لئے ہر شخص بے ایمانی کا میٹر تیز چلا رہا ہے۔ یہ جتنی تیزی سے چلاتا ہے اتنی ہی تیزی سے مہنگائی بھی بڑھتی جاتی ہے اور بہن کی کنواری آہیں بھی دل کو چھلنی کرتی جاتی ہیں اس لئے اب میں مسافروں کو باتوں میں لگا کر یا راستہ خراب ہونے کا بہانہ کر کے لمبے راستے سے لے جاتا ہوں۔ وہ فریب کھا کر مجھے خوشی سے زیادہ پیسے دیتے ہیں اور مجھے اپنی نادانی سے سمجھاتے ہیں کہ یہ دنیا فریب کھا کر ہی خوش رہتی ہے۔

اس طرح میں نے پانچ برس میں بہن کی شادی کیلئے، نئے کپڑے، سونے کے زیورات اور جہیز کا تھوڑا سا سامان جوڑ لیا ہے، لیکن اتنی بے ایمانیوں کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی بہن کے لئے کس طرح بے ایمانی سے ایک دولہا خرید کر لے آؤں؟ اگر ایک دولہا کو پھانسنے کے سلسلے میں ذرا بھی بھول چوک ہوئی تو میں غیر مہذب دلال کہلاؤں گا۔

دارو کی آگ حلق سے اتارتے وقت میں ایسی بہت سی گہری باتیں سوچتا ہوں: جو

فلاح وبہبود کے اداروں اور سماج کے مصلحین کو سوچنا چاہیئے۔ پہلے میں نے ایک ادھا پایا
جب نشہ اپنی اٹھان تک نہیں پہنچا تو میں نے ایک پوا اور حلق سے اتارا۔ پھر سُر میں اگر بے سُری
آواز میں فلمی گیت گاتا ہوا ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دُور تک ڈرائیو کرنے کے بعد ایک برقعہ پوش عورت نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکنے
کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ فٹ پاتھ کی ٹیکسی ہے اور گاہک کی تلاش میں نکلی ہے۔ ایسی برقعہ
پوش ٹیکسیاں میری آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں اس لئے میں نے گاڑی روک دی اور فوراً میٹر کو آن
کر دیا تاکہ معاملہ طے ہونے تک میٹر تیزی سے بل بناتا رہا۔ اس نے نقاب الٹ کر گاڑی کے اندر
جھانکتے ہوئے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر بولی۔

"ارے شیدے تُو ہے؟"

ہاں میں شیدا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ اس شہر کی تمام وہ عورتیں، جو اپنی جوانی کا میٹر آن کر کے
سواری کی تلاش میں نکلتی ہیں، وہ مجھے پہچانتی ہیں، اور میں انہیں پہچانتا ہوں اور ہم سب کو پولیس
والے پہچانتے ہیں اور پولیس والوں کو حرام کی آمدنی پہنچاتی ہے، اس طرح نہایت ایمانداری
سے ہم عورت کی کمائی کو انصاف سے بانٹ کر مہنگائی کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

جب اس نے نقاب الٹ دیا تو اس وقت نشے کے باعث میری کھوپڑی گھوم رہی تھی
میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا پھر جھومتے ہوئے پوچھا۔

"کون زرینہ؟ اری اتنی رات کو نکلی ہے۔ اگر کسی ایماندار پولیس والے نے پکڑ لیا تو سیدھی
حوالات میں پہنچ جائے گی۔"

وہ ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر میرے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"جو پولیس والے ایماندار ہوتے ہیں ان کی معلومات بھی محدود ہوتی ہیں۔ وہ مجھے نہیں
پہچانتے۔ میں پیشہ کرتی ہوں۔ ایسوں کے سامنے تو نے مجھے اپنی گھر والی بنا لیا۔ میں تجھے کیا سمجھاؤں؟
تو نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اس وقت کوئی بہانہ نہ کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ چل گاڑی

آگے بڑھا، راستے میں کوئی نہ کوئی گاہک پھنس ہی جائے گا۔"

میں نے ٹیکسی کے میٹر کی طرف دیکھا، ابھی تک ایک روپیہ دس پیسے بنے تھے۔ میں اتنی
جلدی آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اگر جلدی چلنا ہے تو پھر میں میٹر سے نہیں چلوں گا۔ یہاں سے پٹیل پاڑہ تک
جانے آنے کے بیس روپے لوں گا۔"

"شیدے! تو جانتا ہے اب میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ پہلے گاہک میرے پیچھے آتے تھے
اور مجھے منہ مانگی رقم دیتے تھے اب میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں اور اوپر سے اُجڑ گئی ہوں
اسی لئے دن کی روشنی میں نہیں نکلتی ہوں۔ رات کو برقعہ پہن لیتی ہوں تاکہ پچکے ہوئے گال اور
سوکھا ہوا جسم اچھی طرح نظر نہ آئے۔ کچھ تو گھر سے میک اپ سے چہرے پر رونق آجاتی ہے
اور کچھ گاہک عقل کے اندھے ہوتے ہیں رات کو عموماً شراب کے نشے میں ہوتے ہیں ایسے وقت انہیں
گدھی بھی حُور پری نظر آتی ہے اس طرح مجھے میرے حصے کا رزق ملتا رہتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ میرے قریب کھسک آئی۔ پھر میرے گھٹنے پکڑ کر بولی۔

"رزق ملتا ہے پھر بھی ایک دو وقت کے فاقے ہوتے ہیں۔ رات کے مہربان اتنی رقم
نہیں دیتے کہ میں اس میں سے پولیس والوں کو بھی دے سکوں اور ٹیکسی ڈرائیوروں کا بل ادا کر سکوں
اور مہنگائی کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو کاٹ سکوں۔ آج میں تجھے بیس روپے نہیں دے سکوں گی
شیدے......"

وہ میرے بالکل قریب آگئی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ نشے کی حالت میں سوکھی
ہوا گلاب بھی پُر شباب نظر آتا ہے وہ مجھے دنیا کی سب سے حسین عورت نظر آرہی تھی شراب پی
کر گندی نالیوں میں گرنے کی بجائے کسی سوکھی عورت کی پناہ میں گرنا بہتر ہوتا ہے میں نے اس
سے کہا۔

"میری ٹیکسی میں رہ جا، میں تجھے بیس روپے دوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "تیری بڑی مہربانی ہوگی۔ تو اپنا ہی آدمی ہے۔ مجھے جلدی چھوڑ
دے گا، دوسروں کی طرح پریشان نہیں کرے گا۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ میرا بچہ بہت بیمار ہے۔"
بچے کا ذکر آتے ہی میرا موڈ خراب ہو گیا کیونکہ دس دس کے نوٹ پھینکتے وقت مرد فطرتاً
کنواری اور اچھوتی عورت کا تصور کرتا ہے میں نے بگڑ کر کہا۔

"تم سالی ٹیکسیاں بن کر بچے کیوں پیدا کرتی ہو، میری ٹیکسی نے تو کبھی بچہ نہیں دیا ٹیکسی
کو صرف پیسے پیدا کرنے چاہئیں بچے نہیں۔ چل جا یہاں سے میں بیس پیسے بھی نہیں دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ٹیکسی کی نیم تاریک دنیا میں چند لمحات کے لئے سب کچھ گم
ہو گیا صرف آنسوؤں کی جھلملاہٹ رہ گئی یہ جو شراب ہے نا یہ مجھے بہت کمزور بنا دیتی ہے۔ پرائے
آنسوؤں کی تہہ میں اتار کر اپنے زخم کے حوالے سے بہت کچھ سمجھا دیتی ہے وہ بڑے کرب سے
کہہ رہی تھی۔

"دو دن ہو گئے، میری چھاتی سے دودھ نہیں اترا۔ بچے کو اوپری دودھ پلایا
تو وہ بیمار پڑ گیا۔ مجھے روٹی کے لئے پیسے نہیں چاہئیں نہ کپڑے خریدنے کے لئے میں پرانا
برقعہ اوڑھ کر نہیں نکلی ہوں اور نہ ہی اپنے جسم کو کھنڈر بنا کر شیش محل میں رہنے کا خواب لے کر
آئی ہوں۔ میں صرف بچے کی دوا کے لئے پیسے حاصل کرنے آئی ہوں"

میں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے پتھر بننے کی کوشش کی اور
سخت لہجے میں کہا۔

"تم سب عیاشی کے لئے نکلتی ہو۔ بھانت بھانت کے مردوں کے بغیر تم لوگوں کو
نیند نہیں آتی مگر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اپنی محرومیوں کے افسانے گھڑ
لیتی ہو اور اس افسانے کو کلائمکس پر پہنچانے کے لئے ایک نوزائیدہ دودھ پیتے بچے کو
پیش کرتی ہو، یہ سب محض ڈرامہ ہے اور کچھ نہیں ......"

اچانک ہی وہ میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑنے لگی اور جھنجھلا کر کہنے لگی۔

"تو یہ ڈرامہ نہیں ہے وہ بچہ دودھ کے لئے اور دوا کے لئے بلک رہا ہے۔ وہ بچہ کس
کا ہے؟ کسی حاجی کریم الدین کا ہے، کسی صنعتکار سیٹھ کا ہے یا کسی ہستی رئیس زادے کا ہے
یا تیرے جیسے ٹیکسی ڈرائیور کا ہے سب بے غیرت بے مروت، تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ
تم سب کے مشترکہ بچے کو دودھ پلانے کے لئے اپنے جسم کا کاروبار کر رہی ہوں، تم سب میرے
وجود سے بھاگتی ہوئی ٹریفک کی طرح گزر جاتے ہو اور اس بچے کو چھوڑ جاتے ہو کیا اس کے لئے
دودھ کی ایک بوتل خرید کر نہیں دے سکتے؟"

میں نے جلدی سے بیس روپے نکال کر دے دیے۔ ایک فاحشہ کی زبان پر سنسر کی قینچی چلانے
کے لئے بیس روپے کافی ہیں۔ جو حقیقت ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اسے دولت کی قینچی سے کاٹ کر
پھینک دیا جاتا ہے اس نے دس دس کے دو نوٹ لے کر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لئے اور
ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اپنے بچے کی طرف جانے کے لئے نکلی۔ پھر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور
پلٹ کر بولی۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ ابھی بیس روپے کی قیمت چکانی ہے"

اس نے دوبارہ دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس سے پہلے ہی میں نے گاڑی
اسٹارٹ کی، گیئر بدلا پھر ایک جھٹکے سے ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دور چلا گیا۔ عورت جب ماں
کے روپ میں آتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوا اور اسے گالیاں دیتا ہوا اپنے
گھر کے دروازے پر آ کر رک گیا۔

جب میں دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہوا تو اس وقت رات کے دو بجے تھے۔
شمشاد آنگن میں چارپائی بچھائے اس پہ چاروں شانے چت لیٹی ہوئی شریف احمد کے مکان کو
دیکھے جا رہی تھی۔ ہمارے آنگن سے شریف احمد کے مکان کی اوپری منزل کا ایک کمرہ اور بالکونی
نظر آتی ہے اور اس کی بالکونی سے ہمارا پورا آنگن نظر آتا ہے جب چاندنی راتوں میں شمشاد
چارپائی بچھا کر لیٹ جاتی تھی تو میں سوچا کرتا تھا کہ شریف احمد اپنی بالکونی سے اسے دیکھ رہا ہوگا

پہلے پہل مجھے یہ بات ناگوار گذری تھی پھر حالات نے مجھے سمجھا دیا کہ پرائے ہاتھوں میں جانے والی ہر چیز کو شوکیس میں رکھ کر اس کی اہمیت بڑھائی جاتی ہے اس حد تک اگر وہ میری بہن کو دیکھے اور میری بہن اُسے دیکھے اور دنیا والوں کو اس کی خبر نہ ہو تو یہ بے شرمی نہیں ہے۔

مگر اب وقت گذر چکا تھا۔ شریف احمد، بیلا رانی کو بیاہ کرلے آیا تھا اب شمشاد کے دیکھ رہی تھی؟ اور ایسے دیکھ رہی تھی جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ اسے بھائی کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔ ہر بات اپنے وقت پر سمجھ میں آتی ہے اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ شریف احمد کو نہیں دیکھ رہی ہے بلکہ دماغ کی اسکرین پر بیلا رانی کو سہاگ کے مرحلوں سے گذرتے دیکھ رہی ہے

میں چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ دوسری صبح شریف احمد کے باپ نعیم احمد نے مجھے بلایا۔ دستور کے مطابق بیلا رانی کو اس کے میکے بھیجا جا رہا تھا۔ صبح سویرے اپنی دہاڑی کون برباد کرتا ہے۔ میں ٹیکسی لے کر نکلتا تو اس وقت اچھے پیسے دینے والی سواریاں مل جاتیں۔ محلے والوں سے پیسے کم ملتے ہیں۔ پھر بھی میں نے بیلا رانی کے لئے اس کے میکے جانا منظور کر لیا۔

جب وہ میری ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی تو پچھلی رات کی طرح گھونگھٹ میں نہیں تھی میں نے عقب نما آئینے کا رُخ اس کی طرف پھیر دیا۔ ہائے میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس سانولی لڑکی کا چہرہ کتنا دلکش تھا۔ آئینے سے گذر کر سیدھا دل میں آرہا تھا۔ میں چند لمحوں تک دم بخود ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ دستور کے مطابق شریف احمد کو بھی اس کے ساتھ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن صرف اس کی ماں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ راستے میں، میں نے محسوس کیا کہ شریف احمد کی ماں بہت خاموش ہے اور بہت اداس ہے اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بہو کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو ساس پہلے ہی دن سے اسے ناپسند کرتی ہے اور کبھی خوشی کا اظہار نہیں کرتی۔ بیلا رانی کے میکے پہنچ کر شریف احمد کی ماں نے مجھے انتظار کرنے کیلئے کہا اور بہو کو لے کر مکان کے اندر چلی گئی۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے اندر سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی

کہ کس نے جھگڑا ہو رہا ہے؟ ایک گھنٹے کے بعد شریف احمد کی ماں تنہا واپس آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ میں نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اپنے محلے کی طرف روانہ ہوگیا میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا وہ اپنے ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ مجھے برسوں کی بیمار نظر آئی۔ میں نے پوچھا۔

"ماں جی! کیا بات ہے کیا پہلے ہی دن بہو سے جھگڑا ہوگیا ہے؟

میرے سوال پر وہ چونک پڑی۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ ٹیکسی میں تنہا نہیں ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں کوئی اپنے گھر کے راز کسی غیر کو نہیں بتاتا، وہ میرے سوال کو ٹال گئی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر کی خاتون ہر لمحہ مرتی جا رہی ہے۔

*

کبھی کبھی میری ٹیکسی جنازہ بن جاتی ہے۔ کیماڑی میں ایک کشتی ڈوب گئی تھی کتنے ہی ڈوب کر مر گئے تھے اور کتنے ہی ایسے تھے جنھیں جاں کنی کی حالت میں ایمبولنس کے ذریعے ہسپتال لایا جا رہا تھا۔ شریف احمد کی ماں پچھلے کئی دنوں تک ہسپتال میں بیمار رہنے کے بعد مر گئی تھی اس کی لاش گھر لانے کے لئے ایمبولنس نہیں مل رہی تھی کیونکہ ہسپتال کی تمام ایمبولنس کیماڑی کی طرف گئی ہوئی تھیں میں محلے کا ٹیکسی ڈرائیور ہوں اس لئے اس کی لاش میری ٹیکسی میں لائی گئی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک ہفتہ پہلے اس کی بہو کو دلہن بنا کر لے گیا تھا اب اس ٹیکسی کو جنازہ بنا کر لے جا رہا تھا۔

محلے والے شریف احمد سے اور اس کے باپ نعیم احمد سے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان پر ایک ساتھ کتنے ہی غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ بیلا رانی سہاگ کی دوسری صبح اپنے میکے گئی تھی پھر پلٹ کر اپنے شوہر کے پاس نہیں آئی تھی۔ بہو نے پہلے ہی گھر کو ویران کر دیا تھا، اب ماں کی موت نے بنتے بستے گھر کو اور بھی اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ نعیم احمد رو رو کر محلے والوں کو بتا رہا تھا کہ بہو کتنی بدچڑھی تھی۔ اس کی بیوی بڑے ارمانوں سے اسے بہو بنا کر

رانی تھی۔ وہ پہلی ہی رات شریف احمد سے کہہ رہی تھی کہ وہ ماں باپ سے الگ ہو جائے۔

کسی نے کہا ،، یہ ان مہاجروں نے پہلے مشرقی پاکستان کو الگ کیا اب یہ لڑکی یہاں آکر بیٹے کو والدین سے الگ کر رہی تھی۔ ان لوگوں سے ہمدردی کرنا فضول ہے۔"

نعیم احمد نے کہا ،، ہم تو نیکی کرتے ہیں اور دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے تو چاہا تھا کہ ایک خانماں برباد لڑکی یہاں آکر سکھ چین کی زندگی گذارے گی مگر واقعی یہ مہاجر اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اپنی الگ حیثیت بنانے کے لئے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ ہمارا کیا ہے ایک دن وہ بری طرح پچھتائے گی۔"

میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں نعیم احمد کو روتے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے میری بہن کی خوشیوں کو برباد کیا تھا اور خود بری طرح برباد ہو گیا تھا۔ ظلم کرنے والے کو آنکھوں کے سامنے سزا مل جائے تو مظلوم کے دل کو بڑا سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گذر گئے۔ شریف احمد نے بیلا رانی کو طلاق دے کر اس کے مہر کی رقم پانچ سو روپے ادا کر دی میرے لئے پھر امید بندھ گئی۔ راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اب اس گھر سے کسی دن بھی میری بہن کا رشتہ آ سکتا تھا۔ شمشاد معمول کے مطابق روزانہ کالج جایا کرتی تھی اور میں نے معمول سے زیادہ بے ایمانی شروع کر دی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ آمدنی ہوتی رہے اور بہن کا رشتہ آئے تو محدود آمدنی رکاوٹ نہ بنے۔

ایک صبح وہ کالج نہیں گئی۔ میں کمرے سے نکل کر آنگن میں آیا تو وہ آنگن میں نلکے کے پاس بیٹھی قے کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

،، کیا بات ہے شمشاد تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

میری آواز سنتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اک دم سے گھبرا گئی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا۔ میں

اس کے قریب آیا تو وہ اپنی مٹھی میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو پشت کی طرف لے جا کر چھپانے لگی۔

،، کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام سی کوشش کی لیکن میں نے جبراً اس کی مٹھی کھول دی۔ مٹھی کھلتے ہی آم کے اچار کا ایک ٹکڑا زمین پر گر پڑا۔

میں اک دم سے سناٹے میں آ گیا۔ اب میں ایسا نادان بھی نہیں تھا کہ بات کی تہ تک نہ پہنچ سکتا۔ میں نے ایک زور دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

،، بول یہ سب کیا ہے؟ بے حیا بے غیرت، کیا میں اس لئے تجھے کالج میں پڑھنے کے لئے بھیجتا ہوں؟"

اس کی خاموشی اور اس کے آنسوؤں نے میرے شبہ کی تصدیق کر دی۔ میں بے تحاشہ اسے مارنے پیٹنے لگا۔ ان حالات میں بھائی ہو یا باپ وہ بہت مجبور ہوتا ہے اونچی آواز میں گالیاں نہیں دے سکتا اور گالیاں دے کر بیٹی یا بہن کو خود اپنی زبان سے بدنام نہیں کر سکتا اس لئے میں خاموشی سے اسے مارتا رہا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑی تھی میں اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا وہاں لا کر میں نے اس سے پوچھا۔

،، بتا وہ کمینہ کون ہے؟ میں ابھی اس کے پلے تجھے باندھ دوں گا۔ نہیں بتائے گی تو گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لئے تجھے ختم کر دوں گا۔"

اس نے روتے روتے بتایا کہ وہ کالج کا ایک پروفیسر تھا شاعری کی کتاب پڑھاتے پڑھاتے اسے خوابوں کی دنیا سے گذار کر اپنی خوابگاہ میں لے گیا مگر اب وہ اس شہر میں نہیں ہے ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں جو ٹیکسی ڈرائیور ہوں اور سڑک پر چلنے والی ہر عورت کا چہرہ پڑھ لیتا ہوں۔ اپنی بہن کے پچیس برس کے چہرے کو نہیں پڑھ سکا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میرے آنگن کے درخت میں جو پھل پک رہا ہے وہ پکتے پکتے کبھی دیوار کے باہر گر پڑے گا

میں گہری سوچ میں ڈوبا اپنی بدنامی کے خیال سے کانپ رہا تھا اور ہر شریف آدمی کی طرح اپنی بہن کے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو مٹانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں یوں چونک پڑا جیسے بدنامی دستک دے رہی ہو۔ جب عزت خطرے میں پڑی ہو تو ہر دستک اور ہر آہٹ پر دل کانپتا ہے میں نے دانت پیستے ہوئے شمشاد سے کہا۔

”خبردار، اس کمرے سے باہر نہ نکلنا میں ابھی آتا ہوں۔“ میں اسے غصے سے دیکھتا ہوا ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا اور باہر کے دروازے کو کھول دیا۔ دروازے پر نعیم احمد کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے قد آور ایک صحت مند آدمی تھے اجلی پیشانی کا ایک داغ بتا رہا تھا کہ وہ پانچوں وقت کے نمازی ہیں اس وقت میں کسی نمازی یا فرشتے سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن انہوں نے بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹے میں تمہاری مشکل آسان کرنے آیا ہوں۔“

ان کی بات سن کر مجھے یاد آیا کہ میں شمشاد کو ان کی بہو بنانا چاہتا تھا اس وقت وہ واقعی فرشتہ بن کر آئے تھے میں نے فوراً ہی انہیں کمرے میں لا کر بٹھایا۔ انہوں نے بیٹھتے ہوئے بڑی نرمی سے پوچھا۔

”کیا جوان لڑکیوں کو مارنے پیٹنے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟“

میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ میں نے تو بڑی خاموشی سے شمشاد کی پٹائی کی تھی میری آواز میرے مکان کے دروازے تک بھی نہیں پہنچی تھی، پھر انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں شمشاد کو مار رہا تھا۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”بیٹے، میرا مکان بہت اونچا ہے اور بالکونی سے تمہارا آنگن نظر آتا ہے۔ میں نے شمشاد کو قے کرتے دیکھا تو پہلے یہی سمجھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن تم

غصے کی حالت میں اسے مارنے لگے تو ساری بات میری سمجھ آ گئی۔“

ان کی باتیں سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے مجھے گھبراتے دیکھ کر کہا۔

”میں ایک شریف آدمی ہوں۔ تمہارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا، بلکہ میں تمہاری بدنامی پر پردہ ڈالنے آیا ہوں، میں تمہاری شمشاد کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔“

مارے حیرت کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دنیا میں ایسے فرشتے بھی موجود ہیں جو پرائے گناہ کا بوجھ اٹھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا میری آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”میں تمہارا بزرگ ہوں۔ میں تم سے مذاق کرنے یا جھوٹ بولنے نہیں آیا۔ سارا محلہ جانتا ہے جو بات میری زبان سے نکل جاتی ہے وہ پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ آج شام کو میں چند شریف آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا اور شریف احمد کا نکاح شمشاد سے پڑھوا کر اور اسے اپنے گھر کی عزت بنا کر یہاں سے لے جاؤں گا۔“

میں فرطِ عقیدت سے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں زندگی میں کبھی نہیں رویا اس وقت بھی آنکھیں پونچھنے کیلئے میں نے ہاتھ اٹھایا تو پتہ چلا کہ میری آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے ہیں میں صرف خوشی سے رونے کے انداز میں گڑگڑا رہا ہوں۔ میں بہت سنگدل ہوں انسان کا کوئی جذبہ یا کوئی مصیبت مجھے کبھی نہیں رُلا سکتی۔

پھر وہ آدمی کیسے رو سکتا ہے جس پر مصیبت آتے ہی اس مصیبت کا خوبصورت حل پیش کر دیا جاتا ہے میری وہ مصیبت بھی بڑی آسانی سے ٹل گئی۔ شمشاد دنیا والوں کی نظروں میں عزت آبرو سے دلہن بن کر اسی رات شریف احمد کے ہاں چلی گئی۔ میں نے جو زیورات، کپڑے اور جتنی نقدی بے ایمانی سے جمع کی تھی، وہ بے ایمانی سے بنائی دلہن کے جہیز میں دے دی۔

اس کے بعد میں آزاد ہوگیا اب اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کسی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے مجھے دن رات ٹیکسی چلانا ہے میں اپنی مرضی کے مطابق شہنشاہ بن کر ٹیکسی میں بیٹھتا تھا۔ دل چاہتا تو اپنی پسند کی سواری اٹھا لیتا ورنہ کسی ٹیکسی اڈے پر بیٹھ کر چرس کے سگریٹ پیتا رہتا۔

شادی کے ایک ماہ بعد شمشاد کا حمل ضائع ہوگیا مگر وہ خوش تھی۔ اس کا شوہر اور اس کا سسر نعیم احمد بھی بہت خوش تھے اور شمشاد کی بڑی عزت کرتے تھے ایک سال بعد پھر شمشاد کے پاؤں بھاری ہوئے، کچھ عرصے بعد اس نے ماں بن کر مجھے ماموجان بنا دیا۔

*

کبھی کبھی میری ٹیکسی سماج کی کچرا گاڑی بن جاتی ہے اور اس شہر کی جتنی غلیظ خواہشات ہوتی ہیں انہیں ایک جگہ سے سمیٹ کر دوسری جگہ لے جاتی ہے تقریباً دو سال کے بعد میں نے زیب النساء اسٹریٹ پر بیلا رانی کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اسے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا۔ گرمیوں کی مہکی مہکی سی شام تھی وہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ اس کے ساڑی باندھنے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ بدن کے نشیب و فراز بغاوت کے انداز میں ابھر آئے تھے اس کے جوڑے میں پھولوں کی وینی جھک رہی تھی اور سانولی پیشانی پر سنہری بندیا جگمگا رہی تھی اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ دونوں پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے فوراً ہی عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ وہ آئینے پر ایک نظر ڈال کر مسکراتی ہوئی اپنے ساتھی سے بولی۔

"کہاں چلنا ہے؟"

اس کے ساتھی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سوسائٹی۔ طارق روڈ۔"

میں نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ جب ٹیکسی کچھ دور نکل گئی تو میں نے نئے نوٹوں کی کھڑکھڑاتی آواز سنی۔ ہم ٹیکسی ڈرائیوروں کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو آنکھیں سامنے والے کی طرف دیکھتی رہتی ہے اور باقی آئینے کی دو آنکھیں پیچھے کے مناظر دکھاتی ہیں۔ وہ سو سو کے تین نوٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ بیلا رانی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ پورے پانچ سو......"

اس نے سو کا ایک نوٹ اور بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"میں کوئی فٹ پاتھ کی ٹیکسی نہیں ہوں، مجھ سے اس طرح سودے بازی نہ کرو۔"

اس نے پانچ سو روپے پورے کر دیئے۔ بیلا رانی نے پانچوں نوٹوں کو تہہ کرکے پرس میں رکھ لیا۔ راستے میں اس نوجوان نے ٹیکسی رکوا کر وہسکی کی ایک بوتل خریدی پھر طارق روڈ کی ایک عمارت کے پاس پہنچکر وہ دونوں اتر گئے۔

میری ٹیکسی خالی ہوگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سینہ دل سے خالی ہوگیا ہے وہ شروع ہی سے میرے دل میں دھڑک رہی تھی جب میں نے شریف احمد سے اس کا نکاح پڑھایا تھا۔ اس وقت سے اس کا حنائی ہاتھ میرے دل پر رکھا ہوا تھا آج دوسری بار اس نمکین ہاتھ کو ایک دوسرا شخص پکڑ کر میرے سامنے سے لے گیا تھا۔ ٹیکسی خالی ہونے کے بعد بیلا مہکتی رہی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا جیسے وہ واپس آگئی ہو۔ وہ نہیں تھی پچھلی سیٹ پر بیلا کے پھولوں کی بنی ہوئی وینی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا پھر دونوں ہاتھوں پہ رکھ کر اسے سونگھنے لگا۔ عجیب سی خوشبو تھی۔ میرا خیال ہے بیلے کے ساتھ بیلا کے بدن کا پسینہ بھی مہک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اونچی ٹاؤن

لے سستے علاقے سے زیب النساء اسٹریٹ کے مہنگے علاقے تک کیسے پہنچ گئی؟ وہ کیسے
حالات تھے جنہوں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ بہت اونچی قیمت پر ہر رات پانچ سو روپے دین
مہر کے عوض بک سکتی ہے یہ دین مہر پہلی بار شریف احمد نے مقرر کیا تھا وہاں ایک رات رہ کر
وہ سمجھ گئی تھی کہ یہی اس کی قیمت ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میرا دل دھڑکنے لگا کہ کیا میں اس کی قیمت چکا سکتا ہوں؟ وہ
میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ جب وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آگئی تھی تو اگلی سیٹ
پر بھی آسکتی تھی لیکن میں اس کے لئے ایک ہفتے میں بھی پانچ سو روپے جمع نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکسی
کی قسطیں ادا کرنے میں اور آئے دن اس کی مرمت کرانے میں میری آمدنی کا تین چوتھائی خرچ
ہو جاتا تھا۔ باقی حصے میں سے کچھ ٹریفک پولیس والے لے جاتے تھے اور کچھ نشے کی ضرورتیں
لے جاتی تھیں، باقی پیٹ کی آگ بجھانے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بیلا رانی
میرے لئے بہت مہنگی تھی — بہت اونچی تھی۔ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

جسے ہم چھو نہیں سکتے، اس کے لئے دل زیادہ مچلنے لگتا ہے پہلے تو میں نے سوچا
کہ فی الحال صبر کرنا چاہئے۔ فٹ پاتھ پر جو عورتیں آتی ہیں، پہلے ان کا ریٹ بہت اونچا ہوتا
ہے پھر آہستہ آہستہ وہ بکھرتی جاتی ہیں اور ان کا بھاؤ گرنے لگتا ہے دو چار سال تک
انتظار کرنے کے بعد وہ مجھے پچاس روپے میں مل سکتی تھی۔ اس وقت واقعی میں نے صبر کر لیا
لیکن غیر شعوری طور پر وہ میرے دماغ میں کلبلاتی رہی۔ جب ٹریفک کے ہنگاموں سے
دور رات کی تنہائی اور خاموشی میں، میں نے سونے کی کوشش کی تو اس کا حنائی ہاتھ میری
نگاہوں کے سامنے چلا آیا۔ میں نے اس خیالی ہاتھ کو تھام کر پوچھا۔

"بی بی زیب النساء عرف بیلا رانی، تمہیں شیدے ٹیکسی ڈرائیور کے نکاح میں
بعوض پانچ سو روپے دین مہر فی شب کے حساب سے دیا جا رہا ہے، کیا تمہیں یہ غیر شرعی
نکاح قبول ہے؟"

اس کی سریلی آواز سنائی دی "وہ قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے"

پھر وہ دلہن بنی میرے پہلو میں آگئی۔ میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کے
چہرے کے نقوش کو دیکھنے اور چھونے لگا۔ اسے چھوتے وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔ در و
دیوار گھوم رہے تھے بیلے کے پھولوں کے ساتھ اس بنگالی دوشیزہ کے بدن سے جو پسینہ مہک
رہا تھا اس میں مچھلیوں کی بساند تھی — مجھے ابکائی آنے لگی۔ میرے الٹی کرتے ہی سارے
خواب چکنا چور ہو گئے۔ دراصل میں نے بہت زیادہ پینے کے بعد فرائی کی ہوئی پاپلیٹ مچھلی کھائی تھی
اس مچھلی کی مناسبت سے بنگالی دوشیزہ یاد آ رہی تھی۔

بس اسی طرح وہ کسی نہ کسی بہانے یاد آتی رہی۔ دراصل عورت خود کو دور رکھ کر
اپنی اہمیت بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے اس کے متعلق نہ سوچنے کے باوجود محرومی کا احساس
سوچنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ایسے وقت مجھے ایک لومڑی کی طرح سوچنا چاہئے تھا انگور
کھٹے ہیں مگر وہ سر سے پاؤں تک میٹھی اور رس بھری تھی۔ میں اسے کھٹی کہہ کر دل کو جھوٹی
تسلیاں نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تھوڑے تھوڑے پیسے بچاؤں گا۔ پانچ
سو روپے جمع کرنے کے اسے اپنے گھر لے آؤں گا۔

اس دن سے میں نے پیسے بچانے شروع کر دیے لیکن جو لوگ محدود آمدنی میں پیسے
بچاتے ہیں۔ وہی میرے حالات کو سمجھ سکتے ہیں کہ بچائے ہوئے پیسے اکثر ناگہانی ضرورتوں
کی نذر ہو جاتے ہیں چھ ماہ کے بعد جب میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو گئے تو میں اچانک
ہی بیمار پڑ گیا۔ دکھ بیماری کے آگے کون رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے وہ تو کسی وقت بھی آسکتی ہیں
میں چھ دن تک بیمار رہا۔ چھ دن تک ٹیکسی میرے دروازے پر کھڑی رہی۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ
ہوتا ہے کہ آمدنی رک جاتی ہے مگر ضرورتیں نہیں رکتیں۔ ٹیکسی کا مہاجن اگر ہفتہ واری قسط
لے گیا کچھ دواؤں اور انجکشنوں میں پیسے نکل گئے بیماری سے اٹھ کر بہن کے گھر گیا تو بھانجے
کی سالگرہ تھی اسے کھلونوں کا تحفہ دیکر واپس آیا تو ٹیکسی کا گیر بکس بیٹھ گیا تھا۔ جب اس کی

مرمت کرانے کے بعد کمائی کیلئے نکلا تو اس وقت تک بچائے ہوئے ساڑھے تین سو روپے خرچ ہو چکے تھے اور میں دو سو روپیہ کا قرضدار بن چکا تھا۔ میں نے جھلا کر اپنی تقدیر کو پوری ایک درجن گالیاں دیں اور دل کو سمجھا لیا کہ اللہ میاں نے بیلا رانی کو میرے لئے پیدا نہیں کیا ہے لیکن سمجھانے سے کیا ہوتا ہے جب میں ٹیکسی کے اڈے پر آیا تو جو سب سے پہلی سواری ملی وہ بیلا رانی تھی۔

وہ دستور کے مطابق پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی اس بار میں نے آئینے کا رُخ نہیں بدلا۔ اس لئے کہ جو چیز حاصل نہ ہو، اس سے کترانے کی کوشش کرنا دانش مندی ہے۔ بیلا رانی نے اگلی سیٹ کی طرف جھکتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

"آج تم نے آئینے کا رُخ نہیں بدلا؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"عورت بظاہر خاموش رہتی ہے مگر وہ اپنے آس پاس سے گذرنے والوں کی ایک ایک حرکت کو سمجھتی ہے جب میں شادی کی دوسری صبح اپنے میکے جا رہی تھی، اسی وقت میں نے تمہاری شرارت کو بھانپ لیا تھا تم آئینے میں مجھے بار بار دیکھ رہے تھے۔ اس روز بھی زیب النساء اسٹریٹ پر جب میں پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آئی تو تم نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"تم درست کہہ رہی ہو۔ جب پہلی بار تم دلہن بنی بیٹھی تھیں اور جب میں پہلی بار ایجاب و قبول کیلئے تمہارے پاس آیا تو اسی وقت سے تمہارے حنائی ہاتھوں نے میرے خیالات بہکا دیے کہ تم ان ہاتھوں سے آگے بھی بہت دور تک حسین ہو۔ جب بات کھل ہی گئی ہے تو میں صاف طور سے کہہ دوں کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پچھلے کئی ماہ سے میں نے پانچ سو روپے جمع کرنے کیلئے بڑی جدوجہد کی ہے میں ساڑھے تین سو روپے تک جمع کر چکا تھا

لیکن اچانک ہی بیماری نے مجھے توڑ دیا۔ اب میں دو سو روپے کا قرضدار بن گیا ہوں اس لئے اب میں تمہیں خیالوں کی دنیا میں حاصل کرتا ہوں اور جب خیال کا طلسم ٹوٹتا ہے تو میں بڑی ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا تم مجھے ان اذیتوں سے کسی طرح نجات دلا سکتی ہو؟"

اس نے جواب دیا "پہلے تم اپنا قرض ادا کرو پھر پانچ سو روپے جمع کرو۔ میں تمہیں بڑے شہر کے کسی بھی فٹ پاتھ پر مل جاؤں گی۔ ابھی مجھے پریس کلب جانا ہے گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے اس کی صاف گوئی پر بہت غصہ آ رہا تھا لیکن بزنس آخر بزنس ہے اگر کوئی غریب آدمی میری ٹیکسی رکوا کر یہ کہے کہ وہ بیمار ہے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں اسے ہسپتال پہنچا دوں تو میں کبھی اسے لفٹ نہیں دوں گا کیونکہ ٹیکسی لفٹ دینے کے لئے نہیں، کاروبار کرنے کیلئے ہوتی ہے وہ بھی لفٹ دینے کیلئے نہیں کاروبار کرنے کیلئے نکلی تھی ایک کاروباری کی حیثیت سے مجھے اس کی بات کا بُرا نہیں ماننا چاہئے تھا مگر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ مرد اپنی ناکامی نہیں برداشت کر سکتا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ بہت جلد پانچ سو روپے اس کے منہ پر ماروں گا اس کیلئے میں دن رات ٹیکسی چلانے لگا۔ وقت گذرتا گیا پیسے جمع ہوتے گئے اور ضرورتوں کے چور دروازوں سے نکلتے گئے ہم سے اور آپ سے اگر پوچھا جائے کہ اتنی آمدنی کہاں جاتی ہے تو ہم اخراجات کا صحیح حساب نہیں بتا سکیں گے کیونکہ بہت سی ضرورتیں چوری چھپے آتی ہیں اور نقب لگا کر چلی جاتی ہیں۔

سال کے بعد سال گذرتا گیا۔ وہ مجھ سے ملتی رہی اور بچھڑتی رہی۔ تین سال کے بعد میرے پاس تین سو روپے جمع ہو گئے مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا بھاؤ اک دم سے گر کر دو سو روپے پر آ گیا تھا۔ میں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ جسموں کی منڈی میں بھاؤ ہمیشہ گرتا ہے کسی بھی حالت میں اوپر کی طرف نہیں جاتا۔

وہ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھی تو میں نے اس کی طرف دیکھا وہ مرجھا گئی تھی۔ اس کے

باوجود باسی پھولوں کی اڑی اڑی سی رنگت ابھی باقی تھی۔ اس پر میک اپ کا سلیقہ ایسا تھا کہ وہ کاغذی پھول کی طرح کھل گئی تھی اور کسی بدیسی سینٹ کی مہک نے اس میں اچھی خاصی کشش پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ میرے پاس ایک سو روپے ہیں، حالانکہ جیب میں تین سو روپے تھے بجاؤ گر لٹے تو اور گرانا چاہیئے۔ مجھے اس کا وہ غرور اب تک یاد تھا جب اس نے مجھے طنزیہ انداز میں پانچ سو روپے جمع کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

”مجھے دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے میرا چالان ہو گیا ہے اگر صبح تک میں نے ڈیڑھ سو روپے تھانے میں نہیں پہنچائے تو وہ مجھے حوالات میں ڈال دیں گے۔“

”اچھا تو پھر ڈیڑھ سو لے لو۔“

”مجھے مزید پچاس کی سخت ضرورت ہے میری لڑکی دوسری جماعت میں ہے۔ اس کے لئے نئی کتابیں خریدنی ہیں۔“

میں نے کہا ”اچھی بات ہے رات کے بارہ بجے اسی جگہ آ کر ملنا، میں دو سو روپے لیکر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

اس نے کہا ”ابھی دس بجے ہیں۔ اس وقت بھی رات ہے یہ دو گھنٹے کا انتظار میرے لئے عذاب بن جائے گا۔“

میں نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

”میں پلیسوں سے مجبور نہیں ہوں، محلے والوں سے مجبور ہوں۔ وہاں بارہ بجے کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے میں اسی وقت تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں، تم کبھی اس محلے کی عزت بن گئی تھیں، بہت سے لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی مگر تم اس محلے میں رہتے ہو تمہیں ڈرنا چاہیئے۔ اچھی بات ہے میں دو گھنٹے تک انتظار کروں گی۔“

یہ کہہ وہ ٹیکسی سے اتر گئی۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا

تھا کہ جس گھر میں وہ بیاہ کر گئی تھی، اب وہاں میری بہن رہتی ہے چونکہ بہن کا سسرال گھر کے بالکل سامنے ہے اسی لیئے میں اسے چھپا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا میں نے سوچا دو گھنٹے بعد جب وہ میرے گھر میں آئے گی تو میں دو سو روپے اس کے منہ پر پھینک کر اسے یہ بھی طعنے دوں گا کہ دیکھو تمہیں شرافت کی زندگی راس نہیں آئی۔ جس شریف احمد کو تم ٹھکرا کر چلی گئی تھیں، آج میری بہن اسی شریف آدمی کی بیوی بن کر عزت کی زندگی گزار رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا میری یہ باتیں اس کے دل میں نشتر کی طرح اتریں گی۔

دو گھنٹے بعد جب میں اسی فٹ پاتھ پر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ میں ٹیکسی روک کر سامنے والے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ وہ میری ٹیکسی کو اچھی طرح پہچانتی تھی، جب بھی وہاں آتی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ چائے پی کر میں ہوٹل سے باہر آیا تو ٹیکسی بدستور خالی تھی۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا کہ پتہ نہیں کہاں مر گئی ہے۔ میں وہاں سے چرس کا ایک سگریٹ خریدنے کے لئے تھوڑی دور چلا گیا۔

جب میں سگریٹ کے کش لگاتا ہوا واپس آیا تو ٹیکسی خالی تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے چاروں طرف دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ مزید ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی۔ میں جھنجلا کر گھر واپس آ گیا۔ چرس کا نشہ گھر کی تنہائی میں مجھے تڑپاتا رہا اور میں تڑپ تڑپ کر اسے گالیاں دیتا رہا۔ دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ جب دوپہر کو ٹیکسی لے کر سڑک پر آیا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا اب وہ میری ٹیکسی میں بیٹھنا بھی چاہے گی تو نہیں بٹھاؤں گا، اسے دور ہی سے دھتکار دوں گا۔

رات کے نو بجے میں نے ٹیکسی کا میٹر باندھ دیا اور اسے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے پینے کے لئے چلا گیا۔ رات کے ایک بجے واپس آیا تو گھر کا دروازہ کھولتے وقت ٹیکسی کا پچھلا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ نیم تاریکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے کے باوجود اسے پہچان لیا۔ میں جو اسے دھتکارنا چاہتا تھا، اسے دیکھتے ہی سہم کر آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ

پکڑ کر کھینچتے ہوئے گھر کے اندر لا کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بہن کے سسرال والے اسے دیکھ لیں۔ کمرے میں آنے کے بعد میں نے غصّے سے پوچھا۔

"کل تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا تھا؟"

"تمہارے جانے کے بعد مجھے تین سو والی ایک اسامی مل گئی تھی۔"

"تم اس طرح سر جھکا کر کہہ رہی ہو جیسے بہت مظلوم ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم کتنی مکّار اور چالباز ہو۔ آج سے پانچ برس پہلے جب میں نے تمہاری آرزو کی تھی تو تم نے خالص کاروباری انداز میں مجھے ٹھکرا دیا تھا۔"

وہ بولی "کاروبار آخر کاروبار ہوتا ہے۔ اس میں مکّاری بھی ہوتی ہے اور چالبازی بھی۔ تم نے محبت سے تو میری تمنا نہیں کی تھی۔ تم عورت کو مشین بنا کر یہ توقع کیوں کرتے ہو کہ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہوگا۔ کبھی میرے سینے میں دل دھڑکتا تھا، کبھی میں تمنا کرتی تھی کہ کوئی مجھے محبت سے اپنائے، کوئی مجھے ٹائم ٹیبل کے مطابق ملنے والا کھانا نہ سمجھے لیکن تم جیسے مرد نگاہوں کے ایکسرے سے صرف عورت کے لباس کے اندر جھانکتے ہو۔ اس کے سینے میں کتنا خوبصورت دل ہے، یہ کبھی نہیں سمجھتے۔ جب مجھے فٹ پاتھ پر لے آئے ہو تو پھر میرے کاروباری لہجے کا بُرا کیوں مانتے ہو؟ یہ دیکھو میں کاروبار میں کتنی دیانت دار ہوں۔ کل مجبور ہو گئی تھی آج اس کی تلافی کے لئے آ گئی ہوں یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہو کر یا اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں۔ میں نے کاروباری مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے اگر انکار کرو گے تو واپس چلی جاؤں گی۔"

اس کی باتیں سن کر میں نرم پڑ گیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ کاروبار میں انکار و اقرار کی تکرار ہوتی ہی رہتی ہے، مجھے بُرا نہیں ماننا چاہیئے تھا۔ میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ روپے لے کر اپنے پرس میں رکھنے لگی۔ یہ وہی پرس تھا جسے میں نے پہلی بار زیب النساء اسٹریٹ پر دیکھا تھا۔ شاید اس سے دو سال پہلے بھی یہ پرس اس

کے ساتھ رہا ہوگا۔ جب سے وہ اس راستے پر آئی تھی وہ پرس بھی اس کے ساتھ آیا تھا اور اب اس کی طرح رفتہ رفتہ پرانا ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں جو رنگ برنگے نگ جڑے ہوئے تھے وہ جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ آدمی کی جیب بھرا یا پرس ہو۔ وہ اپنی آمدنی کے مطابق ہلکا ہوتا اور مرجھاتا جاتا ہے۔

میں اپنی عادت سے مجبور ہوں، طنز کا موقعہ آئے تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ پرس شاید اس وقت بھی تمہارے ساتھ رہا ہوگا جب تم پہلی بار دلہن بن کر اس سامنے والے مکان میں آئی تھیں؟"

اس نے پلٹ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن چشم تصور میں وہ مکان نظر آ گیا جہاں وہ دلہن بن کر گئی تھی۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"اس مکان کی بات نہ کرو، وہ جگہ جہنم سے بدتر ہے۔"

میں نے حقارت سے کہا۔

"کیا آج کل تم جنت میں زندگی گذار رہی ہو؟ خبردار اس مکان کو جہنم نہ کہنا کیونکہ وہ میری بہن کی جنت ہے جہاں تم شرافت سے نہیں رہ سکیں، وہاں میری بہن عزت آبرو سے زندگی گذار رہی ہے۔"

اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر دھپ سے چارپائی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"کیا تم نے اپنی بہن کو وہاں بیاہ دیا؟ یہ کب کی بات ہے؟"

"جب تمہیں طلاق دی گئی، اس کے چھ ماہ بعد میری بہن اس گھر کی عزت بن گئی۔ اس کی شادی کو ساڑھے چھ برس گذر گئے ہیں۔"

"تعجب ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا "اب تک تمہاری بہن کو بھی میری طرح فٹ پاتھ

پر آجانا چاہیے تھا "

"بکواس مت کر۔ ذلیل کمینی ......"

میں چیختے چیختے سنبھل گیا۔ رات کے سناٹے میں میری آواز بہن کے سسرال تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ تلخی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

"تم سمجھ دار ہو۔ اچھا ہوا خود ہی غصّے کو ضبط کر لیا۔ مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری بہن کے متعلق ایسی بات کہہ دی۔ میں کیا کروں؟ میں بھی زخم کھائی ناگن کی طرح تڑپتی ہوں اور جو بھی سامنے آجائے اسے ڈس لینا چاہتی ہوں۔ پہلے میں ایسی نہیں تھی۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ عورت کو صرف محبت ملتی ہے نفرت بھی ملے تو وہ اسے محبت میں بدل دیتی ہے بہت پہلے جب میں سولہ برس کی تھی تو میری زندگی میں ایک نوجوان آیا۔ وہ بہت خوبصورت تھا اسے دیکھ کر اس کی عبادت کرنے کو جی چاہتا تھا میں اپنی خوش قسمتی پر۔ اک دم سے پاگل ہو گئی۔ اس کی خوبروئی اور اس کی شخصیت کے سامنے اپنی ذات کو گم کر دیا۔ محبت میں ایسا ہوتا ہے کہ عورت اپنے آپ کو مار کر صرف اپنے محبوب کی شخصیت کا ایک حصّہ بن جاتی ہے اس کے بعد وہ کچھ اور بننے کی تمنا نہیں کرتی مگر بہت جلد محبّت کا یہ سپنا ٹوٹ گیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔ سات سمندر پار جانے کے بعد وہ کہاں گم ہو گیا، میں نہیں جانتی لیکن اس وقت تک میری معصومیت، میرا کنوارا پن، سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف محبت کی تلخ اور شیریں یادیں رہ گئی تھیں میں نے سوچا تھا کہ انہی یادوں کے سہارے زندگی گذار دوں گی لیکن والدین میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے تھے جوان لڑکی بیاہی نہ جائے تو وہ سوسائٹی میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتے وہ میری شادی کی فکر کرنے لگے۔ انہی دنوں مشرقی پاکستان میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں نہیں جانتی کہ کون بنگالی اور کون بہاری ہے، اس ہنگامے میں جو لوگ میرے باپ کو قتل کر کے مجھے اٹھا کر لے گئے تھے ان کا تعلق انسان کی کسی قوم سے یا کسی ذات سے نہیں تھا۔ میرے والدین بہاری ہیں لیکن میں پیدائشی طور پر بنگالی ہوں کیونکہ بنگال میں میرا جنم ہوا ہے اس

ہنگامے میں ایک بار بنگالیوں کا پلّہ بھاری ہوا۔ دوسری بار بہاریوں کا پلّہ بھاری ہو گیا۔ جب مجھے بنگالی اٹھا کر لے گئے تو انہوں نے مجھے بہاری لڑکی سمجھ کر میری عزت کو کھلونا بنایا کیونکہ وہ میرے بہاری والدین کی مناسبت سے مجھے جانتے تھے جب بہاریوں نے میری عزت لوٹی تو میں ان کی نظروں میں بنگالی تھی کیونکہ میں نے بنگلہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے میں بنگالی زبان روانی سے بولتی ہوں، اُردو اچھی طرح بول نہیں سکتی "

وہ ایک گہری سانس لے کر ذرا دیر کے لئے چپ ہوئی پھر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

"میں کسے الزام دوں؟ کوئی پاکستانی ہوتا تو میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر اسے شرم دلاتی۔ وہاں سے یہاں تک میں نے یہی دیکھا کہ سب بنگالی، بہاری، پنجابی، سندھی، اور سرحدی ہیں اور فٹ پاتھ کی دنیا میں یہ قومیں بھی تقسیم ہیں، صرف دلال اور گاہک ہیں۔ پاکستانی کہیں سو رہے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ مجھے فٹ پاتھ پر کون لایا ہے؟"

میں نے کہا "کوئی بھی لایا ہو لیکن جب تمہیں شرافت کی زندگی گذارنے کا موقع ملا تو تم نے دلہن بننے کے بعد بھی اس زندگی کو ٹھکرا دیا "

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"ہاں۔ میں دلہن بنی تھی اس لئے کہ ہر عورت کے دل میں دلہن بننے اور پھر ماں بننے کا ارمان ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خیالی جنت کا خواب ہوتا ہے میں اپنی آنکھوں میں ایک خواب سجا کر اس سامنے والے گھر میں سہاگ کی سیج پر آئی تھی۔ اس رات میرے خواب پورے ہو گئے۔ میں نے دیکھا میرا شوہر ادھیڑ عمر کا آدمی ہے مگر بہت محبت کرنے والا ہے اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں درندے دیکھے تھے جو عورت کی مرضی کے خلاف اسے چھین لیتے ہیں مگر اس نے بڑی محبت سے میرے وجود کے ذرّے ذرّے کو حاصل کر لیا "

"پھر تم نے ایسی محبت بھری زندگی کو کیوں چھوڑ دیا؟"

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ میں بتاتی ہوں۔ تم بیچ میں نہ بولو۔ صبح چار بجے تک میں اس کی آغوش میں رہی پھر وہ غسل کر کے نماز پڑھنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری ساس میرے پاس آئی۔

اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر بڑی لجاجت سے کہا۔

"بیلا رانی، اب تم اس گھر کی عزت ہو اس لئے تمہیں بھی اس گھر کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا۔ میرا بیٹا شریف احمد شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سے وہ جوان ہوا تھا ہم اس کے لئے فکرمند تھے کہ گھر میں بہو کیسے آئے گی۔ نہیں آئے گی تو لوگ میرے بیٹے کا مذاق اڑائیں گے کہ وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔ میں کسی طرح اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ یوں سمجھو کہ میں اس کی مردانگی کا بھرم رکھنا چاہتی تھی لیکن جب وہ تیس برس کا ہو گیا اور مسلسل شادی سے انکار کرتا رہا تو میرے خاوند نے ایک تجویز پیش کی۔ وہ تجویز ایسی تھی کہ میرے بیٹے کی لاج رہ جاتی لیکن میں ایک عورت ہو کر اس تجویز کو کبھی پسند نہیں کر سکتی تھی پہلے میرے خاوند نے مجھے بہت سمجھایا پھر مجھے اور میرے بیٹے کو مارنے پیٹنے لگا۔ میں اپنے اوپر ظلم برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن آئے دن اپنے بیٹے کو لات جوتے کھاتے نہیں دیکھ سکتی تھی مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی دن اسی طرح میرے بیٹے کو مار ڈالے گا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی اور یہ شادی ہو گئی ابھی تمہارے ساتھ جو رات گذار کر نماز پڑھنے کے لئے گیا ہے وہ میرا خاوند نعیم احمد تھا......"

میں لڑکھڑا کر ایک بیک یوں پیچھے چلا گیا جیسے بیلا رانی نے مجھے زور کا طمانچہ مارا ہو اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔ شراب کے نشے میں تو گھومتا ہی ہے لیکن حالات کے حرامی نشے نے میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ ہم سب کیسی حرامی زندگی گذار رہے ہیں۔ فٹ پاتھ سے لیکر شریف گھرانوں کے آنگنوں تک ہم کیسی دوغلی حرکتیں کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی نورانی پیشانی پر سجدوں کا داغ بنائے نماز پڑھنے بھی جاتے ہیں۔

اس وقت میری نگاہوں کے سامنے بیلا رانی نہیں تھی، شمشاد سہاگ کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بچے کو گود میں کھلا رہی تھی۔

وہ کس کا بچہ ہے؟ چاروں طرف سے ایک ہی سوال گونج رہا تھا وہ بچہ کس کا ہے؟

وہ بچہ کسے اپنا باپ کہے گا؟ جو دادا ہے اسے باپ کہے گا۔ جو باپ ہے اسے سوتیلا بھائی کہے گا۔ جو بہو ہے وہ بیوی ہے جو بیوی ہے وہ سوتیلی ماں بن گئی ہے۔ آخ تھو۔ ہم اس دنیا میں کیسے کیسے رشتوں کی کھچڑیاں پکا کر کھاتے ہیں، ہضم کرتے ہیں اور ڈکارے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔

میں چکرا کر گر پڑا۔ مجھے صرف اتنا ہوش ہے کہ بیلا رانی مجھے سہارا دیکر چارپائی پر لے آئی تھی۔ میں غصے، نفرت اور توہین کے احساس سے کانپ رہا تھا میری نس نس میں شرارے سلگ رہے تھے میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر تکلیف سے تڑپ رہا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کو ایک مہذب چکلے میں بھیجا تھا اور اپنے ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کے گاہک کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا کیونکہ اس میں میری بہن کی بدنامی تھی وہ اپنے بچے کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جاتی۔

میں سڑکوں پر ٹیکسی چلانے والا اور فٹ پاتھ کی زندہ ٹیکیوں کو اپنے منافع کی انگلیوں پر نچانے والا مداری اپنی بہن کو اس سطح پر ناچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب اپنی انگلی کٹتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کا گلا کیسے کٹتا ہے اس وقت میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آنکھ سے آنسو نکل جائیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دوں مگر نہ جانے آنسو میرے پتھریلے وجود کے اندر کہاں چھپے ہوئے تھے یہ کب جاگیں گے اور کب میری پلکوں کی دہلیز تک آئیں گے میں زندگی کے ہر درد و کرب سے گذرتا ہوں مگر آنسو میری بے حیا آنکھوں میں نہیں آتے۔

جب آنسو نہیں نکلے تو اندر کا سارا غبار بخار کی صورت میں ابھر آیا۔ بیلارانی نے مجھے چھو کر کہا۔

”تمہیں تو بخار چڑھ رہا ہے کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے میرے جوتے اتار دیے اور دوسرے کمرے سے لحاف لا کر مجھ پر ڈال دیا۔ لمحہ بہ لمحہ بخار تیز ہوتا جا رہا تھا اور میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ مجھے ہوش بھی تھا۔ بیلارانی میرے قریب تھی۔ اس نے کہا۔

”میرے پاس اسپرو کی دو ٹکیاں ہیں انھیں کھا لو۔“

پتہ نہیں اس نے وہ دو گولیاں مجھے کیسے کھلائیں۔ اس وقت مجھے بیلارانی جیسی عورتوں کے پرس یاد آ رہے تھے جن میں بی سی ٹیبلٹ ہوتی ہیں۔ جن میں اسپرو کی ٹکیاں ہوتی ہیں جن میں خواب اور گولیاں ہوتی ہیں، جن میں ان کے ہر زخم کا علاج ہوتا ہے کاش کہ میری بہن کے پرس میں بھی کوئی ایسی ٹکیہ ہوتی جسے نگل کر وہ ہمیشہ کی نیند سو جاتی مگر میرے سوچنے سے میری بہن نہیں مر سکتی تھی اور میری دنیا کی بے حیائی نہیں مر سکتی تھی اسے مارنے کے لیے مجھ جیسے لوگوں کو مرنا پڑے گا لیکن میں کیسے مر سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ اگر مجھ جیسے لوگ اتنی جلدی، اتنی آسانی سے مر جاتے تو بیلارانی جیسا پھول پیار کے گلدان میں سجنے کی بجائے سماج کے اگالدان میں نہ پہنچایا جاتا۔

صبح تک میں بخار میں پھنکتا رہا۔ بیلارانی میرے پاس رہی حالانکہ اسے چلا جانا چاہیے تھا جب اس کا خریدنے والا بیمار تھا اور اسے اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا تھا تو ایسی صورت میں ہمارے درمیان کوئی جھوٹا رشتہ بھی نہیں رہ جاتا تھا وہ میرے گھر سے جا سکتی تھی لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ وہ صبح تک رہ کر اور میری تیمارداری کے فرائض انجام دے کر دو سو روپے وصول کرنا چاہتی ہے دو سو روپے کی رقم بہت بڑی ہوتی ہے وہ صبح تک میرے پاس رہ کر کہہ سکتی تھی۔

”سودے کے مطابق میں نے تمہارے ساتھ رات گزار دی ہے اب اگر تم مجھے ہاتھ نہ لگا سکے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

لیکن صبح ساڑھے چار بجے جب اذان کی آواز آنے لگی تو اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے دو سو روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہمارا سودا مکمل نہ ہو سکا۔ تم نے مجھ سے میری قیمت وصول نہیں کی اس لئے میں یہ روپیہ نہیں لے سکتی۔“

یہ کہہ کر اس نے سو سو کے دو نوٹ میرے سرہانے رکھ دیے اور پرس بند کر کے اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

”ابھی اندھیرا ہے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے اگر نعیم احمد نے دیکھ لیا تو میرا کچھ نہیں بگاڑے گا اس کا سر میرے سامنے شرم سے جھک جائے گا بشرطیکہ اسے شرم آ جائے لیکن تم اس کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے کیونکہ وہ تمہارا اصلی بہنوئی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے نعیم احمد کا ڈر نہیں تھا۔ میں صرف محلے والوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے اس خیال سے میں نے اپنے بستر کے سرہانے کی طرف سے ذرا سا اٹھ کر لائٹ آف کر دی اور سرہانے کی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا باہر سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا میں باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا اس وقت گلی ویران تھی صرف ایک کتا چہل قدمی کر رہا تھا لیکن جس وقت بیلارانی میرے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور چند قدم آگے بڑھی، اسی وقت سامنے میری بہن کے مکان کا دروازہ کھلا۔ نعیم احمد سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے نماز پڑھنے کیلئے مسجد کی طرف جانے والا تھا۔ ہم دونوں کے مکان کے درمیان تقریباً بارہ گز کا فاصلہ تھا۔ اتنے قریب سے وہ بیلارانی کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بیلارانی بھی رُک کر اسے دیکھنے لگی۔ پہلے تو نعیم احمد نے میرے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ

شاید میں نظر آؤں گا۔ پھر اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا میں تاریکی میں پردے کے پیچھے تھا اُسے نظر نہ آسکا پھر اس نے محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کسی طرف سے بدنامی کا چھینٹا اُڑ کر اس کے اُجلے دامن تک نہیں آسکے گا تو وہ بیلا رانی سے نظریں ملا کر اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

بیلا رانی کی پشت میری کھڑکی کی جانب تھی اس لئے میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا ویسے میرا خیال تھا کہ وہ نفرت کا اظہار کرے گی اور اس کمبخت پر تھوک کر چلی جائے گی لیکن وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ایک ادائے ناز سے کھڑی ہوئی تھی اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ساڑھی کا آنچل ڈھلکا دیا پھر سینہ تان کر ایک ہاتھ سے پرس کو جھلاتی ہوئی لچکتی اور بل کھاتی ہوئی نعیم احمد کی طرف بڑھنے لگی۔

اُسے اپنی طرف آتے دیکھ کر نعیم احمد اک دم سے بوکھلا گیا اور پلٹ کر مسجد کی طرف تیز قدموں سے جانے لگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر بیلا رانی وہاں سے پلٹ گئی پھر کھڑکی کے پاس آکر آہستگی سے بولی۔

"بس۔ مرد کی مردانگی یہیں تک ہوتی ہے۔ تم لوگ عورت کے سامنے صرف تنہائی کے مرد میدان ہو۔ تنہائی سے باہر اسی عورت سے سامنا ہو جائے تو خدا یاد آجاتا ہے۔ تمہارا دو غلا بہنوئی اللہ میاں کے پاس پناہ لینے گیا ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی اور پرس جھلاتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں اتنی دیر بیٹھنے کی وجہ سے تھک گیا تھا نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔ ایک رات کے بخار نے مجھے بہت کمزور بنا دیا تھا۔ نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں، اس دنیا کی زہریلی سچائی نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مجھے بیلا رانی کی زہریلی ہنسی پر غصہ نہیں آیا۔ میں نعیم احمد کو دیکھ کر جھلا گیا تھا۔ میرے جی میں آیا تھا کہ میں دوڑتا ہوا باہر جاؤں اور اس کا گلا دبا دوں۔ لیکن میرے ہاتھ بہت کمزور ہو گئے تھے کیونکہ میں نے نادانستگی میں ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کو اس کے عشرت

کدے میں بھیجا تھا۔ مجھے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب وہ ایسی شرمناک زندگی نہیں گذارے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے میں بہن کے دروازے تک نہیں جا سکتا تھا کیونکہ بستر پر اٹھ کر بیٹھتے وقت اب میرا سر چکرانے لگتا تھا۔

میں بہت دیر تک اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور خیال ہی خیال میں نعیم احمد کو قتل کرتا رہا۔ آدھ گھنٹے کے بعد نعیم احمد زیر لب مقدس آیتیں پڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی اور میرے چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"تمہارے دیکھنے کا انداز بتا رہا ہے کہ بیلا رانی تمہیں سب کچھ بتا چکی ہے۔"

میں نے غصے کی حالت میں تھوک اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہ مجھے بتا چکی ہے کہ تم کتنے بڑے شیطان ہو۔ مجھے بیماری سے اُٹھنے دو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا ہوا کہ تم بیمار ہو۔ نہ زیادہ چیخ سکتے ہو نہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے ہو۔ اس طرح میں سکون سے کچھ باتیں کر سکوں گا۔ ابھی بیلا رانی کو تمہارے گھر سے نکلتے دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ٹیکسی ایک ایسی سواری ہے جہاں سے شہر کا ہر آدمی ایک بار ضرور گذرتا ہے ٹیکسی میں شریف عورتیں بھی سفر کرتی ہیں اور بازاری بھی۔ مجھے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ بیلا رانی بازاری بن چکی ہے مگر تمہیں اپنی ٹیکسی میں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔"

"میں کسی کو بلانے نہیں جاتا سواریاں خود ہی ہاتھ اٹھا کر مجھے بلاتی ہیں۔ اچھا ہوا کہ وہ آگئی اور اس نے تمہارے شیطانی چہرے کو ننگا کر دیا۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی میری بہن کو یہاں لے آؤ۔"

"تمہاری بہن جہاں ہے، اسے وہیں رہنے دو۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے
تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے یا مجھے بدنام کرنا چاہو گے تو میرے ساتھ تمہاری بہن بھی بدنام ہو گی۔
شریف احمد ایک آہنی پردہ ہے جس کے پیچھے تمہاری شریف بہن عزت سے زندگی گزار رہی
ہے۔"

میں نے غصے سے چیخ کر کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔"

"شیدے! غصہ کرنے سے پہلے یہ سوچو کہ شادی سے پہلے تمہاری بہن ماں بننے والی
تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک میں ہی ہوں جس نے تمہیں بدنامی سے بچایا ہے اگر میں اس گناہ کی گٹھڑی
کو اپنے گھر نہ لاتا تو کیا اس وقت بھی تم اسی طرح چیخ چیخ کر کہہ سکتے تھے کہ تمہاری بہن بدکار ہے
نہیں ایک بھائی اپنی زبان سے اپنی بہن کے لئے ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا اور آج بھی تم ایسی بات نہیں
کہہ سکتے۔ اگرچہ وہ آج بھی بدکار ہے مگر باسی مٹھائی پر چڑھے ہوئے چاندی کے ورق کی طرح
وہ چمکیلی اور عزت دار زندگی گزار رہی ہے۔ اس عزت کی چمک کے پیچھے وہ کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟
وہ کیسی ہے؟ میں کیسا ہوں؟ یہ نہ دیکھو تم کیوں اور کیسے کا نشتر لے کر نکلو گے تو یہ ساری دنیا
تمہیں بڑی گھناؤنی نظر آئے گی۔"

"میں تمہاری ان فضول باتوں کو سمجھنا نہیں چاہتا۔ تم ابھی جاؤ اور میری بہن کو یہاں پہنچا دو۔"
وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

"میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم ٹیکسی چلاتے وقت دوسروں کی بہنوں کو ایک جگہ سے
دوسری جگہ پہنچاتے ہو۔ انہیں ان کے گھر بھی واپس لے آتے ہو۔ میں بھی تمہاری بہن کو تمہارے
گھر پہنچا دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کی باتیں میرے سینے میں خنجر کی طرح اتر رہی تھیں
میں جو کچھ کرتا رہا اب وہی میرے سامنے آیا۔ کیا اتنے شرمناک واقعے کے بعد مجھے عبرت حاصل ہو سکتی تھی؟

ہاں عبرت حاصل ہوئی لیکن میں کس طرح شرافت سے زندگی گزار سکتا تھا؟ اور دوسروں
کو گمراہی سے بچا سکتا تھا؟ کیا بیلارانی جیسی عورتیں میری ٹیکسی میں آ کر بیٹھیں تو میں انہیں نصیحتیں شروع
کر دیتا؟ نیک ہدایت دینے والے اس دنیا میں بہت ہیں لیکن نیکی پھر بھی کہیں نہیں ہے میں بیلارانی
کو اپنی ٹیکسی میں نہیں بٹھاؤں گا تو اس کے لئے ہزاروں ٹیکسیوں کے دروازے کھلے ہیں بیلارانی توبہ کرکے
شریفوں کی دنیا میں آئے گی تو پھر کوئی شریف آدمی غیر شرعی دین مہر ادا کرکے ایک عورت کی کمزوری
سے فائدہ اٹھائے گا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لمحہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں آپ کو بھی
سمجھاتا ہوں اور میں اس دنیا کے ہادی اور مصلحین کو بھی سمجھاتا ہوں کہ تم اب تک غلطی سے چوروں
بدمعاشوں اور غلط کاروں کو سمجھاتے آئے ہو۔ دراصل تمہیں شریف آدمیوں کو سمجھانا چاہیے کیونکہ
اس دنیا کی زیادہ سے زیادہ غلاظتیں شریف گھرانوں کی دہلیز سے نکل کر فٹ پاتھ پر آتی ہیں۔

نعیم احمد جلد ہی شمشاد کو لے کر میرے پاس آیا۔ شمشاد اپنے چار برس کے لڑکے کو
اٹھائے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر میرے کمرے کے اندر نہیں آئی۔ اس کا جھکا ہوا سر بتا رہا
تھا کہ اسے تمام حالات کا علم ہو چکا ہے میں نے اُسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔

"شمشاد! تم اندر آؤ اور اس خبیث کو باہر جانے دو۔ اگر میں بستر سے اٹھنے کے قابل
ہوتا تو اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا۔"

شمشاد اندر نہیں آئی۔ نعیم احمد باہر نہیں گیا۔ اس نے کہا۔

"شیدے! تو احمق ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیلارانی میری زندگی سے نکل کر کہاں
پہنچی ہے؟ تو اپنی بہن کو میری زندگی سے نکال کر کہاں پہنچانا چاہتا ہے؟ اس معاشرے
میں تیری کونسی عزت ہے کہ تو اس عزت کا تھوڑا سا حصہ بہن کو دے سکے گا؟ اگر حقیقت کی نظر
سے دیکھے گا تو یہ شمشاد، بیلارانی کی سطح پر زندگی گزار رہی ہے ایسے وقت عقل کی ضرورت ہوتی
ہے اگر آنکھوں میں کوئی عیب ہو تو تاریک شیشوں کی عینک لگا کر اسے چھپایا جاتا ہے۔
اس طرح سیاہ چشمے سے گورے چہرے کا حسن بھی بڑھ جاتا ہے ہر برائی کو چھپانے کے لئے

ایک خوبصورت نقاب کی ضرورت ہوتی ہے اس محلے میں جو میری شہرت جو میری عزت ہے اس سے زیادہ خوبصورت نقاب تیری بہن کو نہیں مل سکتا۔ اچھی طرح سوچ لے تو شمشاد کو مجھ سے چھین کر اس کی زندگی برباد کرے گا۔

وہ جھوٹی عزت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے بڑی عمدہ تجویز پیش کر رہا تھا۔ یہ بات ابھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی تھی اگر میں خاموش رہتا تو یہ راز یہیں دفن ہو جاتا اور ہم سب سماج کے عزت دار افراد کی طرح پھر سے زندگی گزارنے لگتے۔ میں نے شمشاد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ پہلی بار بولی۔

"مجھے اس راہ پر لانے والا ایک معلم ایک پروفیسر تھا۔ جب تعلیم دینے والے ایسی راہوں پر لگا دیں تو ایک کے بعد دوسری راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ مجھے دوسری راہ کا یہ رہبر ملا۔ یہ میرا مجازی خدا نہیں ہے مجازی کا مطلب جھوٹ اور فرضی ہے تو پھر یہ میرے جسم و جان کا جھوٹا خدا ہے اس کے بعد میں کسی تیسرے کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہتی۔ میں جہاں ہوں مجھے وہیں پڑا رہنے دو۔ یوں بھی اب میں صرف تیری بہن ہوں اپنے اس بچے کی ماں ہوں۔ یہ دنیا والوں کے لئے ناجائز سہی لیکن بچہ کبھی ماں کے لئے ناجائز نہیں ہوتا میں اس بچے کی زنجیر سے نعیم احمد کے ساتھ بندھ چکی ہوں۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ ہو سکے تو یہ گھر اور یہ محلہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ اب ہماری نگاہیں ملیں۔ کم از کم بھائی بہن کی آنکھوں میں اتنی تو حیا ہو کہ وہ بدکار زندگی کے آئینے میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ حیا کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ جب سے وہ دروازے پر آئی تھی اس نے ایک بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی تھی اور تب یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ جنہیں ہم گناہ گار کہتے ہیں وہ ہمارے تمہارے سامنے لباس تو ضرور کھولتی ہیں لیکن حیا سے آنکھ نہیں کھولتیں۔ اتنی بڑی دنیا میں شرم اگر کہیں ہے تو صرف عورت کی آنکھوں میں ہے۔

*

کبھی کبھی میری ٹیکسی جرائم کا اڈہ بن جاتی ہے رات کے وقت میں گرومندر سے سواری اٹھا کر آگے بڑھا تو لسبیلہ کے چوراہے پہ چاروں طرف سے پولیس کی جیپ کاروں نے میری ٹیکسی کو گھیر لیا۔ پچھلی سیٹ پہ بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے ٹیکسی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑ لئے گئے۔ میری ٹیکسی کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے درمیان ایک بڑا سا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے جب مجھے بھی ہتھکڑی پہنائی تو پتہ چلا کہ اس تھیلے میں چرس بھری ہوئی تھی میں نے تھانے کی طرف جانے کے دوران بڑی بڑی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں مجرم نہیں ہوں ان لوگوں کو میں نے پہلے نہیں دیکھا جو چرس کا تھیلا لے کر کہیں جا رہے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور کب ایماندار اور شریف سمجھے جاتے ہیں؟ کسی نے میری سچائی کا یقین نہیں کیا تھانے کا انچارج اتنا ایماندار تھا کہ ان تین مجرموں کی بڑی سے بڑی رشوت بھی کام نہ آسکی اس نے ہم سب کے باری باری بیانات لئے۔ جب میرے بیان دینے کی باری آئی تو میں نے ٹیکسی کے ڈیش بورڈ سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ نکال کر بتایا کہ میں نے دس برس پہلے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ حالات مجھے ٹیکسی ڈرائیور بنا کر ایک ایسی جگہ لے آئے ہیں جہاں صرف چور بدمعاش آتے ہیں۔

تھانے کا انچارج واقعی شریف آدمی تھا۔ وہ میری تعلیمی صلاحیتوں سے اور میری باتوں سے متاثر ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میں مانتا ہوں کہ مسافروں کو ٹیکسی میں بٹھانے سے پہلے ان کا سامان چیک کرنے کا دستور نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی میں بیٹھنے والے غیر قانونی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہیں پھر بھی اکثر ٹیکسی ڈرائیور دانستہ مجرموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی ٹیکسیوں کو جرائم کا اڈہ بناتے ہیں اگر کوئی شریف آدمی تمہاری شرافت کی ضمانت دے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس وقت تک تمہیں حوالات میں رہنا پڑے گا کوئی ایک آدمی ہو تو مجھے اس کا نام اور پتہ بتاؤ، میں اسے یہاں بلواؤں گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کس شریف آدمی کا نام اور پتہ بتاؤں؟ اس دنیا میں شریف آدمی ضرور بستے ہوں گے لیکن میں زندگی کی جس ٹریفک سے گذرتا آیا ہوں وہاں کوئی شریف آدمی کبھی نظر نہیں آیا۔ اب میں تھانے کے انچارج سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جوابًا یہی کہتا کہ آدمی خود شریف ہو تو اسے شریفوں کی صحبت مل جاتی ہے میں نے کہا۔

”جناب! میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ میرے دن رات کا زیادہ حصہ ٹیکسی میں بیٹھ کر یا سو کر گذرتا ہے کراچی شہر میں کوئی شریف آدمی تنہا یا اپنی فیملی کے ساتھ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ ایک ہی کرائے کے مکان میں نہیں رہ سکتا۔ مالک مکان ہزار بہانوں سے اسے مکان خالی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے مکان خالی کرانے کے لیے کبھی وہ اپنے مکان کو فروخت کرنے کا بہانہ کرتا ہے۔ کبھی بیرونِ ملک سے اس کے رشتے دار آنے والے ہوتے ہیں کبھی اس کی بیٹی کی شادی کیلئے مکان خالی کرنا پڑتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک ہم ایک مکان اور ایک محلے میں رہ کر وہاں کے شریف لوگوں سے تعلقات پیدا کریں، اس وقت تک ہم مکان بدر اور محلہ بدر کر دیے جاتے ہیں یا پھر وہ شریف لوگ محلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جو ہماری شرافت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں، میں ضمانت کیلئے کسے طلب کر سکتا ہوں؟ مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔“

مجھے رات بھر سوچنے کیلئے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ میرے لیئے بڑی شرم کی بات تھی کہ میں اتنی طویل زندگی میں ایک بھی شریف آدمی سے دوستی نہیں کر سکا تھا۔ اگر دوستی اور تعلقات پیدا بھی کئے تو اس نے اپنی شرافت کے پیچھے چھپی ہوئی ذلالت دکھا دی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے ایمان اور کون سی تہذیب کی کسوٹی پر شریف آدمی پہچانے جاتے ہیں؟

میں حوالات کی سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا کہ اتنے میں بیلا رانی آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک اچھا قبول صورت نوجوان تھا۔ اس نوجوان نے تھانے کے انچارج کو سلام کرنے کے بعد بیلا رانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جناب یہ میری بیوی ہے۔ میرا نام مصلح الدین ہے ابھی میں لسبیلہ چوک سے گذر رہا تھا

تو شیدے ٹیکسی ڈرائیور کو آپ گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ شیدے بہت اچھا انسان ہے اس نے ایک بار میری بیوی کو غنڈوں سے بچایا تھا۔ ابھی ہم اس خیال سے یہاں آئے ہیں کہ شاید ہم کسی طرح شیدے کے احسان کا بدلہ چکا سکیں ہم غریب آدمی ہیں روپے پیسے سے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ جس طرح ممکن ہو، یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ یہ شریف آدمی چرس کا دھندا نہیں کرتا ہے“

تھانے کے انچارج نے پوچھا۔ ”تم کہاں رہتے ہو؟“

”اورنگی ایک نمبر میں“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”ریڑھے پر پھل بیچتا ہوں“

اتنے میں ایک سپاہی نے تھانے کے انچارج سے کہا۔

”سر! آپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں لیکن یہ بیلا رانی اس تھانے میں کئی بار آ چکی ہے یہ پیشہ کرنے والی عورت ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ اس نوجوان سے شادی کر چکی ہے“

تھانے کے انچارج نے گھور کر بیلا رانی اور مصلح الدین کو دیکھا۔ بیلا رانی نے جلدی سے کہا۔

”حضور! پہلے میں بری عورت تھی مگر خدا کی قسم میں چھ ماہ سے ایک وفادار بیوی بن کر مصلح الدین کے ساتھ شرافت کی زندگی گذار رہی ہوں اگر میں پہلے کی طرح ہوتی تو اتنی دلیری سے یہاں نہیں آتی۔ کیا میں نہیں جانتی ہوں کہ یہاں کے تمام سپاہی مجھے جانتے ہیں، یہاں میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ چونکہ میں جھوٹی نہیں ہوں اس لیئے اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوں“

تھانے کے انچارج نے کہا۔

”یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم شرافت کی زندگی گذار رہی ہو لیکن ہم نہیں جانتے کہ تم کب تک مستقل مزاجی سے عزت سے زندگی گذارو گی۔ ابھی تم آزمائشی دور سے گذر رہی ہو۔

مجھے افسوس ہے کہ ابھی تمہاری کوئی ضمانت یا کسی طرح کا یقین دہانی قابلِ قبول نہ ہو گی۔ تم دونوں اگر شیدے کے کام آنا چاہتے ہو تو کسی ایسے شخص کو لاؤ جو اس معاشرے کا یا اپنے علاقے کا معزز اور شریف انسان ہو۔"

میں نے سلاخوں کے پیچھے سے بیلا رانی کو دیکھا۔ وہ مایوس ہو کر کبھی میری طرف اور کبھی مصلح الدین کی طرف دیکھ رہی تھی مصلح الدین کی نگاہوں کی بے بسی بتا رہی تھی کہ اس نے بھی اس معاشرے میں کوئی معزز اور شریف انسان نہیں دیکھا ہے یہ عجیب سی بات ہے کہ کانٹوں کی زندگی میں پھولوں کا حسن ہوتا ہے۔ سائے کی زندگی میں سورج کی اجلی اور شفاف کرنیں ہوتی ہیں پھر ہم جیسے ذلیل انسانوں کی زندگی میں کوئی اُجلے، بے داغ دامن والا شریف آدمی نظر کیوں نہیں آتا۔ آخر یہ شریف آدمی کہاں پائے جاتے ہیں۔

بیلا رانی اور مصلح الدین وہاں سے اٹھ کر کسی معزز آدمی کی تلاش میں چلے گئے میں بیلا رانی کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اُسے کبھی غنڈوں سے نہیں بچایا تھا وہ خواہ مخواہ میرے ناکردہ احسان کا بوجھ اٹھائے آئی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ اس نے صرف تھانیدار کو متاثر کرنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ پتہ نہیں اس میں کہاں تک سچائی تھی کہ وہ مصلح الدین سے شادی کر چکی ہے۔

ایک گھنٹہ بعد میں نے سلاخوں کے پیچھے سے نعیم احمد کو دیکھا۔ وہ ایک بغل میں فائل دبائے اور دوسرے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے کی ایک چھڑی پکڑے ہوئے تھا۔ بدن پر کفن کی طرح سفید لباس تھا جو اس کی شخصیت اور کردار کو اُجلا اور بے داغ بتا رہا تھا اس کی پیشانی کا داغ اور خضاب رسیدہ مختصر سی داڑھی اس کے شریف اور ایماندار ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہی تھیں وہ حسبِ معمول زیرِ لب مقدس آیتیں پڑھ رہا تھا میں چیخ کر کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے ان مقدس آیتوں کو چھین لو۔ کلامِ پاک کو مذاق نہ بناؤ۔ کیا یہ ہدایات دینے والی کتاب ایسے ہی بے ایمان نمازیوں کے لئے اتاری گئی ہے؟

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ میری زبان کھلتے ہی اس کے ساتھ میری بہن بھی بدنام

ہو جاتی۔ ویسے بھی کیا ہم سب اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے اور اپنی جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے خدا کی قسم اور کلامِ پاک کی قسم نہیں کھاتے ہیں؟ وہ بھی مقدس آیتوں کو کھا رہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ پھر تھانے کے انچارج کو سلام کرتے ہوئے مصافحہ کیا اس کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ کر فائل کو کھولتے ہوئے کہا

"بندے کو شیخ نعیم احمد کہتے ہیں۔ خاکسار آج سے بارہ برس پہلے اپنے محلے کا بی ڈی ممبر اور اس کے بعد چیئرمین رہ چکا ہے یہ دیکھئے، یہ ہیں کاغذات ......"

وہ فائل سے ایک ایک کاغذ نکال کر دکھانے لگا۔ وہ کاغذات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے محلے کا سب سے عزت دار اور مخلص انسان ہے۔ اس نے چیئرمین بننے کے بعد محلے میں پانی کے نلکے لگوائے ہیں پرائمری اسکول کھلوایا ہے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے محلے کی ایک گلی کو آج بھی نعیم احمد کہا جاتا ہے غرض کہ اس دنیا میں نیک کام کر کے وہ مرنے کے بعد جنت میں جانے کے تمام اہم سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا ہے۔

اتنے اہم سرٹیفکیٹ دیکھ کر تھانے کا انچارج اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پوچھا۔

"آپ شیدے کو کیسے جانتے ہیں؟"

نعیم احمد نے جواب دیا۔ "شیدے کی سگی بہن میرے بیٹے کی شریکِ حیات ہے حالات نے اسے ٹیکسی ڈرائیور بنا دیا ہے ورنہ یہ شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کی بہن کو بڑی عزت آبرو کے ساتھ اپنی بہو بنایا ہے۔"

تھانے کے انچارج نے مطمئن ہو کر کہا۔

"یہ بات شیدے کو پہلے ہی بتانا چاہیئے تھا کہ وہ آپ جیسی معزز ہستی کا رشتے دار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ اتنے خوددار ہوتے ہیں کہ بہن اور بیٹی کے سسرال والوں کو تھانے کچہری میں بلا کر زحمت نہیں دیتے ہیں بہرحال آپ شیدے کو ساتھ لیجائیے مگر اس

کیس میں جب بھی شیدے کی طلبی ہو، اسے عدالت میں حاضر کرنا آپ کی ذمہ داری ہوگی۔"

نعیم احمد نے ذمہ داری لے لی اور میں رہا کر دیا گیا۔ حوالات کے آہنی دروازے سے نکلتے وقت یہ عقدہ حل ہو گیا کہ اس معاشرے کے شریف آدمی صرف کیریکٹر سرٹیفکیٹ میں پائے جاتے ہیں۔

میں نے نعیم احمد سے بات نہیں کی۔ تقریباً دو برس سے میں نے اس کی اور اپنی بہن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ سے زیادہ کمینہ آدمی مجھ سے زیادہ شریف بن کر میری ضمانت کے لئے آ جائے گا۔ مجھے اس کا احسان نہیں لینا چاہئے تھا۔ اسی طرح حوالات میں رہنا چاہئے تھا مگر اس کمبخت نے تھانے میں آ کر بھی بڑی معصومیت سے کہہ دیا تھا کہ میری بہن اس کے گھر میں ہے۔ ایسی صورت میں، میں اس کی رشتہ داری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ تھانیدار کے سامنے میرے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

میں نعیم احمد کے ساتھ تھانے سے باہر اپنی ٹیکسی کے پاس آیا۔ وہاں بیلا رانی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نعیم احمد میرے ساتھ سامنے والی سیٹ پر آ گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیلا! تم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میری ہمدردی میں اب تک یہاں موجود رہیں۔"

بیلا رانی نے خوشی سے لہک کر کہا۔

"ارے واہ! میری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہوئی اس شریف مرغے کو میں ہی تو پکڑ کر لائی ہوں۔"

میں نے حیرانی سے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا نعیم احمد کو تم بلا کر لائی ہو؟"

"ارے شیدے! تو نے بھی گھاس کھائی ہے۔ مجھ جیسی ٹیکسی کے بلانے سے بھلا کوئی

شریف آدمی گھر سے نکل کر آ سکتا ہے؟ میں نے مصلح الدین کو قاصد بنا کر اس کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ تیرا سالا شیدے حوالات میں ہے ....."

میں نے غصے سے کہا۔ "بکواس مت کر۔ میں اس بدمعاش کا سالا نہیں ہوں۔"

وہ بولی۔ "تیرے انکار کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی تو گرم کیوں ہوتا ہے چل تجھے سالا نہیں کہوں گی پہلے میری بات تو سن لے۔ تیرا یہ بہنوئی ..... نہیں پھر مجھ سے بھول ہو گئی اسے تیرا بہنوئی کہوں گی تو پھر سالا بن جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حرامی رشتوں کو دنیا والوں کے سامنے کن رشتوں سے پکارا جائے؟ میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ سالا نعیم تیری ضمانت کے لئے یہاں آنے سے انکار کر رہا تھا۔"

نعیم احمد نے عاجزی سے کہا۔

"دیکھ بیلا رانی! میں عزت دار آدمی ہوں تو مجھے گالی نہ دے۔ کیا تو سیدھی طرح بات نہیں کر سکتی؟"

"کیا تو سیدھی طرح تھانے آ گیا تھا؟ میں نے مصلح الدین کے ذریعے دھمکی دی تھی کہ شیدے کی ضمانت نہیں لے گا تو میں تیری پارسائی کا پول کھول دوں گی محلے والوں سے کہوں گی کہ وہ تیرے جوان بیٹے کا معائنہ کرائیں اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ بیلا رانی اور شمشاد کی گود میں ایک بچہ کہاں سے آیا ہے؟"

میرے منہ پر پھر ایک بار طمانچہ پڑا۔ بیلا رانی کے ساتھ میری ..... بہن کا نام آ رہا تھا میں نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی روک دی۔ پھر اپنا سر اسٹیئرنگ پر ٹیک دیا کیونکہ میرا سر جھکا رہا تھا جو بھی الٹے سیدھے رشتے قائم ہو چکے تھے، میں انہیں کہاں تک جھٹلا سکتا تھا میں ایک عزت دار بدمعاش کا سالا کہلانے سے انکار کر سکتا تھا لیکن بیلا رانی اس سچائی سے انکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اور میری بہن کا بیٹا آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں اور ایک ہی نعیم احمد کی اولاد ہیں۔

نعیم احمد نے ہم دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

"خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ میں یہاں سے رکشے میں چلا جاؤں گا۔ تم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس دنیا کا سب سے ذلیل انسان ہوں۔ جو گناہ کر رہا ہوں، اس سے توبہ نہیں کر سکتا۔ توبہ کروں گا تو شمشاد اور اپنے بیٹے سے رشتہ توڑنا ہوگا۔ رشتہ ٹوٹنے کے بعد شمشاد میرے گھر سے نکلے گی تو میں دنیا والوں کو کیا کہوں گا کہ میری بہو کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ کس کا بچہ لیکر جا رہی ہے؟ خدا کے لئے تم دونوں میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے بے غیرت بن کر نیک نام رہنے دو۔"

میں نے دروازے کی طرف اُسے زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"جا، بھاگ یہاں سے۔ ذلیل کمینے! نہ میری کوئی بہن ہے، نہ تجھ سے میرا کوئی رشتہ ہے تو صرف بیلارانی کی دھمکی سے گھبرا کر میری ضمانت کے لئے آیا تھا۔ جا اب یہ تجھے دھمکی نہیں دے گی۔"

وہ دروازہ کھول کر جانے لگا تو بیلارانی نے کہا۔

"دھمکی کیسے نہیں دوں گی؟ شیدے، جب بھی عدالت میں تیری پیشی ہوگی، یہ اُلّو کا پٹھا تیرے ضامن کی حیثیت سے ضرور آئے گا۔ نہیں آئے گا تو اس کی شرافت کی ایسی تیسی کر کے رکھ دوں گی۔"

"میں آؤں گا تو جب بھی بلائے گی، میں چلا آؤں گا،" اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "مگر تو میرے محلے میں نہ آنا۔ خدا کے لئے میری عزت رکھ لینا......"

وہ عزت کی بھیک ان سے مانگتا رہا جو بے عزت تھے میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بیلارانی نے کہا۔

"شیدے: اتنی زندگی گذارنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے زندگی گذاریں؟ کس سے محبت کریں اور کس سے نفرت کریں؟ کس کی عزت کریں اور کس کی بے عزتی کریں؟ میں نے جھنجلا کر نعیم احمد کی جو بے عزتی کی ہے، اس میں کھوکھلا پن ہے کیونکہ میں بالواسطہ اس کی عزت

کرتی ہوں یعنی اس کی دی ہوئی بیٹی جو میرے پاس ہے میں اس بیٹی سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے شریف خون کو بازار میں نہیں لا سکتی۔ وہ میری بھی بیٹی ہے میں اسے عزت آبرو سے دلہن بنا کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔ سوچا جائے تو میں اس شیطان کی عزت کا بھرم رکھ رہی ہوں سوچا جائے تو تو بھی سر بازار اُسے بہن کی خاطر گالیاں نہیں دے سکتا۔ دنیا والوں کے سامنے اس کی عزت کرنے پر مجبور ہے ہم لوگ جو عزت والے نہیں ہیں اسی طرح دوسروں کو عزت دار بناتے ہیں۔"

عزت کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ اب وہ بھی عزت کی زندگی گذارنے کی کوشش کر رہی ہے میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا سچ مچ تو نے مصلح الدین سے شادی کر لی ہے؟"

"ہاں شادی تو ہو گئی ہے مگر سچ مچ ہو گئی ہے یا نہیں؟ یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔"

"اس بات کا مطلب کیا ہوا؟"

"مطلب یہ ہوا کہ مصلح الدین کے ماں باپ مجھے بہو بنانے کے لئے راضی نہیں تھے اس کا باپ بہت دولتمند ہے پھلوں کا تھوک بیوپاری ہے مصلح الدین مجھ پر جان دیتا ہے جب اس نے ماں باپ کی بات نہیں مانی تو اُسے گھر سے نکال دیا گیا۔ وہ میرے عشق میں ثابت قدم نکلا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس میں یہ حوصلہ اس لئے بھی پیدا ہوا کہ میں نے پرانے دھندے سے توبہ کر لی تھی۔ میں اپنی لڑکی مونا کے ساتھ ایک دو وقت کے فاقے کرتی تھی مگر گاہک کی تلاش میں گھر سے نہیں نکلتی تھی اگر ایک عورت اپنے مرد کے اعتماد کے مطابق تمام پچھلے گناہوں سے توبہ کر لے اور آئندہ پارسا اور وفادار بن کر رہے تو مرد پورے خلوص سے، لگن سے اور تندہی سے اپنے گھر کی جنت آباد کر لیتا ہے۔ مصلح الدین اپنے گھر سے کچھ پیسے لیکر نکلا تھا۔ اس نے ان پیسوں سے پرانا ٹھیلہ خرید لیا ہے اور فٹ پاتھ پر پھل بیچا کرتا ہے ہم نے اورنگی میں ایک کمرے کا مکان کرائے پر لیا ہے اس گھر میں میری بیٹی مونا کی معصوم باتیں ہیں اور میرے محنت کرنے والے مرد کا پیار ہے۔ ہائے شیدے! میں بیان نہیں کر سکتی کہ...... جب وہ دن بھر کی محنت

کی کمائی لاکر میری ہتھیلی پر رکھتا ہے تو میں اپنی ہی نظر میں کتنی عزت دار بیوی بن جاتی ہوں "

"میں نے تجھ سے یہی پوچھا کہ تو اس کی بیوی بن چکی ہے یا نہیں ؟"

"ہاں۔ ایمانداری سے بن چکی ہوں مگر کسی ایمان والے قاضی نے میرا نکاح نہیں پڑھایا۔ وہ کہتا تھا کہ پہلے اپنے ماں باپ کو یا کسی بزرگ کو ساتھ لاؤ مگر اس کے بزرگ فٹ پاتھ کی عورت کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے تھے ہم ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے قاضی اور مولوی کے پاس گئے لیکن سب یہی سمجھتے تھے کہ مصلح الدین مجھے کہیں سے بھگا کر لایا ہے اور، چوری چھپے نکاح پڑھانا چاہتا ہے انہوں نے کہا کہ پہلے کورٹ سے اجازت حاصل کریں، جب اجازت مل جائے گی تو شرعی طور سے نکاح پڑھا دیا جائے گا۔

کورٹ میں جانے کے لئے وکیل کی ضرورت تھی اور وکیل کے لیے فیس کی ضرورت تھی۔ ابھی مصلح الدین نے پھل بیچنے کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تھا اتنے پیسے فاضل نہیں تھے کہ ہم وکیل اور عدالت کے چکر میں پڑتے۔ جب ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو ہم تھک ہار کر گھر میں آ بیٹھے۔

میں نے مایوسی سے کہا۔

"مصلے! کیا یہ دنیا نہیں چاہتی ہے کہ میں شریف عورت بنوں ؟"

وہ محبت سے بولا۔ "نہیں بیلا! اللہ تعالیٰ جب اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے تو انہیں ایسی ہی آزمائشوں سے گذرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے "

"میں تو بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گذر جاؤں گی۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے، تیری فکر ہے۔ تو یہاں ایک ہی کمرے میں مجھ سے ذرا دور سوتا ہے۔ نہیں، سوتا نہیں ہے رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا ہے مگر نکاح سے پہلے میرے ساتھ سونا گناہ سمجھتا ہے ایسے تو راتیں جاگ کر بیمار پڑ جائے گا۔ آدمی کو اتنا بھی شریف نہیں ہونا چاہیئے کہ کھانے کی پلیٹ سامنے رکھ کر بھوکے پیٹ کروٹیں بدلتا رہے "

"مگر بیلا، ایسا کھانا حرام ہوتا ہے "

"وہ تو کسی طرح مجھے حلال کر دے ......"

وہ مجھے گہری لگن سے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں مجھے حلال کرنے کی شدید خواہش تھی۔ اس نے اپنی خواہش سے مجبور ہو کر کہا۔

"تجھے حلال کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ میں خود ہی دولہا اور خود ہی قاضی بن جاؤں خداوند کریم ہمارے نکاح کا گواہ ہوگا۔ شرافت کی زندگی گزارنے کیلئے نیک نیتی سے جو کام کرو وہ خدا کو منظور ہوتا ہے۔ بول اس طرح نکاح قبول کرے گی ؟"

"ہاں۔ ہزار بار قبول کروں گی "

"ہزار بار نہیں صرف تین بار "قبول" کہنا ہوگا۔ چل اب اٹھ کے وضو کر لے "

ہم دونوں نے وضو کیا۔ ہمارے کمرے کی ایک دیوار پر کعبہ کی سمت اللہ اور محمد کے طغرے لگے ہوئے ہیں، ہم ادھر منہ کر کے بیٹھ گئے۔ مصلح الدین زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے مگر اسے سورۂ فاتحہ اور چاروں قل اچھی طرح یاد ہیں، انھیں پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔

"بی بی زیب النساء عرف بیلا رانی! میں مصلح الدین ولد معین الدین تمہیں اپنے نکاح میں بعوض دین مہر ــــــ ارے ہاں۔ میں تو یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ مہر کی رقم کتنی ہوگی ؟ اس وقت میرے پاس صرف بارہ روپے ہیں "

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا "میرا ریٹ بارہ روپے نہیں ہے "

وہ ایک دم سے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے بھی فوراً ہی عقل آگئی کہ نکاح کے وقت ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ میں نے ندامت سے کہا۔

"مصلے مجھے معاف کر دے۔ پتہ نہیں یہ بات میری زبان پر کیسے آگئی۔ مجھے مہر کی رقم بارہ روپے منظور ہے "

اس نے کہا۔ "لیکن میں نے یہ بارہ روپے کل صبح راشن لانے کے لئے رکھے ہیں "

"میں مہر کی اس رقم سے راشن لے آؤں گی "

"نہیں بیلا! میں عورت کی کمائی کھاتا ہوں اور نہ ہی میں تجھے دی ہوئی مہر کی رقم راشن کے لئے واپس لوں گا۔ شادی سے پہلے دال روٹی کی فکر ضروری ہے۔ یہ پیسے راشن کے لئے رہیں گے۔"

"اگر نقد رقم نہیں ہے تو مہر معجّل کی کیا ضرورت ہے جو فوراً ادا کیا جاتا ہے ابھی مہر موجل ہونا چاہیئے یعنی جب میں مطالبہ کروں گی تو مجھے وہ رقم ادا کر دینا۔"

"اوں ہونہہ۔ میں شادی کی پہلی ہی رات عورت کے پیسے اپنے ذمّے رکھنا نہیں چاہتا شرع محمدیؐ کے مطابق انسان کی حیثیت دیکھ کر مہر کی رقم مقرر کی جاتی ہے اس وقت میری حیثیت نقد رقم کی صورت میں نہیں بلکہ مال کی صورت میں یہ پھل وغیرہ ہیں۔ ان میں سے کچھ پھل میں تیرے مہر کے لئے مخصوص کر دوں گا پھر تیرے حصّے کے پھل جیسے جیسے فروخت ہوتے رہیں گے، میں ان کے پیسے لا کر تجھے دیتا رہوں گا۔"

میں نے یہ بات منظور کر لی۔ پھر اس نے نکاح پڑھاتے ہوئے کہا۔

"بی بی زیب النساء عرف بیلا رانی! کیا تم مصلح الدّین ولد معین الدّین کو اپنے نکاح میں بعوض ایک درجن مالٹے، ایک سیر سیب اور دو درجن کیلے بطور مہر معجّل قبول کرتی ہو؟ کہو میں نے قبول کیا......"

میں نے تین بار قبول کیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے وہاں سے اٹھایا اور اپنے بستر پر لا کر بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنی انگلی سے اسٹین لیس اسٹیل کی انگوٹھی نکال کر میری انگلی میں پہنائی۔ اس کے بعد گھونگھٹ اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا۔ مجھے پیار کیا اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اتنی لمبی عمر گذارنے کے بعد پہلی بار ایک سچے مرد نے مجھے زندگی کی سچی مسرّتیں دیں خدا کی قسم یہ دنیا اسی لئے خوبصورت ہے کہ ابھی یہاں مصلح الدّین جیسے اصلاح کرنے والے اور ذلّت کی ماری ہوئی عورتوں کو عزّت دینے والے موجود ہیں۔

"شید ے! میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دنیا والوں کی نظروں میں ہمارا نکاح ہو چکا

ہے یا نہیں مگر میں مطمئن ہوں کہ اس نکاح کے بعد میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایک شریف آدمی کی پناہ میں آگئی ہوں۔"

میں بیلا رانی کی باتوں سے اور مصلح الدّین جیسے اصلاحی جذبہ رکھنے والے نوجوان سے بے حد متاثر ہوتا رہا۔ میں نے کہا۔

"بیلا! تو نے یہ اچھا کیا کہ مصلح الدّین سے شادی کر لی۔ اس طرح تجھ سے زیادہ تیری بیٹی مونا کو تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ جب وہ جوان ہو گی تو مصلح الدّین کی سرپرستی میں کوئی اسے غلیظ نظروں سے دیکھ نہیں سکے گا۔"

"میری مونا بہت اچھی ہے بہت خوبصورت ہے ابھی چھ برس کی گڑیا ہے مجھے اسی کی فکر کھائے جا رہی تھی، اب تمام فکروں سے آزاد ہوں۔ میں مر جاؤں گی، تب بھی مصلح الدین باپ بن کر کسی شریف گھرانے میں اسے بیاہے گا۔ میری آخری تمنا یہی ہے کہ میری گڑیا رانی کو ایک اچھا گھر اور ایک اچھا شوہر ملے۔ تم اسے دیکھو گے تو اس پر بڑا پیار آئے گا۔ کیا تم میری گڑیا رانی کو دیکھو گے؟"

"ہاں میں اس معصوم کلی کو ضرور دیکھوں گا۔ جس کی حفاظت کیلئے تم نے گناہ گار زندگی سے توبہ کر لی ہے اور اس بچی کے اطراف شرافت کی مضبوط دیواریں کھڑی کر رہی ہو۔ اسی لئے تو میں اونٹ گلی کی طرف جا رہا ہوں۔"

بیلا رانی نے حیرت سے کہا۔

"ارے ہاں! مجھے تو باتوں میں یاد ہی نہ رہا کہ تم میرے ہی گھر کی طرف جا رہے ہو میں نے مصلح سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر میں رہے کیونکہ مونا وہاں اکیلی ہے یہ سوچ کر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میری بیٹی کی حفاظت کیلئے اس کا ایک باپ موجود ہے۔"

وہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتانے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے اس کے گھر کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ مصلح الدّین نے باہر نکل کر ہمیں دیکھا۔ اس نے میری رہائی پر مبارکباد دینے

ہوئے مصافحہ کیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے اور چھوٹے سے آنگن کا گھر تھا اس گھر میں چھوٹی چھوٹی ضرورت کی چیزیں تھیں اور جو سب سے بڑی چیز تھی وہ مونا کا پیار تھا وہ معصوم بچی ایک چارپائی پر سو رہی تھی۔ وہ صرف چھ برس کی تھی مگر قد میں ماں کے کاندھے کے برابر ہوتی جا رہی تھی۔ بچے یوں بھی معصوم ہوتے ہیں مگر نیند میں اور بھی معصوم نظر آتے ہیں یہ ان کی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب ان کے خوابوں میں صرف پریاں اور شہزادے آتے ہیں اس زندگی کا کوئی المیہ ان معصوم خوابوں کو مجروح نہیں کرتا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی کی تمام غلاظتوں سے نکل کر ایک ایسی خوبصورت دنیا میں آگیا تھا جہاں صرف نئی نسل کے ننھے منوں کی معصومیت ہوتی ہے۔

میں وہاں بہت دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر چائے پینے کے بعد میں نے جیب سے دس روپے نکال کر خوابیدہ مونا کی مٹھی میں رکھ دیے اور بیلا رانی سے کہا۔

"یہ صرف تم دونوں کی نہیں، میری بھی بیٹی ہے مجھے بتاؤ کہ یہ کس اسکول میں پڑھنے جاتی ہے کل سے میں روز صبح یہاں آیا کروں گا اور اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسکول پہنچایا کروں گا۔ یہ اسکول کے نئے کپڑے پہنے گی، اس کے نئے بستے میں نئی کتابیں ہوں گی اور ہم تینوں مل کر اسے ایک نئی اور صاف ستھری زندگی کا درس دیا کریں گے۔"

بیلا رانی کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کو دیکھ رہی تھی اور اس کے مستقبل تک جو راستہ گیا تھا، اس راستے کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔

❋

کبھی کبھی میری ٹیکسی سیاست کا اکھاڑہ بن جاتی ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنگامے ہو رہے تھے جلسے جلوسوں کی ہنگامہ آرائیاں کاروباری زندگی کو معطل کر رہی تھیں۔ شاہراہوں اور گلی کوچوں کے نقشے بدل گئے تھے جہاں زندگی کی رونق تھی وہاں اسی زندگی

کو ختم کرنے کے لئے گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ تیس برسوں میں کتنے ہی بار انقلاب لانے اور عوام کی حالت بہتر بنانے کا فریب دیا گیا ہر فریب کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلائی گئیں اب پھر نئے انقلاب کے لئے چراغ روشن کئے جا رہے تھے اور یہ چراغ غریبوں کے لہو سے روشن ہو رہے تھے کیونکہ سڑکوں پر وہی مارے جا رہے تھے اور کرفیو کے اوقات میں آمدنی اور راشن کے بغیر وہی بھوکے مر رہے تھے جنہیں کھانے کے لئے کچھ مل جاتا تھا، وہ اپنے گھروں میں تاش کی بازیاں جما رہے تھے جنہیں کچھ نہیں مل رہا تھا وہ چوریاں کر رہے تھے جنہیں چوریوں سے دولت حاصل ہو رہی تھی وہ کرفیو کے سنہری مواقع کو اور طول دینے کے لئے سڑکوں پر ہنگامے کر رہے تھے دیانت داری سے انقلاب لانے والے کم تھے اور کرپشن بڑھانے والے زیادہ تھے یہ بات لوگوں کے سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ انقلاب لانے سے پہلے عوام کے ذہنوں میں تعمیری انقلاب لانے کی ضرورت ہوتی ہے جب تک غریبی اور جہالت رہے گی، اس وقت تک کوئی بھی نظام سچائی سے قائم نہیں ہو سکتا......

میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی ٹیکسی کا میٹر خراب کر دیا تھا کیونکہ ان دنوں لوگ حواس باختہ تھے ہنگامے کے دوران ادھر سے اُدھر بھاگتے تھے اور مجھے منہ مانگا کرایہ دیتے تھے۔ میری ٹیکسی میں دونوں طرف کے سیاسی کارکن وقتاً فوقتاً آکر بیٹھتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے اور تمام راستے میں تقریر کرنے کے انداز میں گفتگو کرتے تھے پھر آپس میں بحث کرنے کے دوران مجھ سے بھی پوچھتے تھے کہ میں کس پارٹی کے ساتھ ہوں میں ایک ناخدا ہوں جو سواریوں کو ٹریفک کے سمندر سے گزار کر ساحل پر پہنچاتا ہے میں کرائے کے سلسلے میں تھوڑی سی بے ایمانی کرتا ہوں مگر انہیں منجدھار میں کبھی ڈبوتا نہیں، میں نا اپنے ہی جیسی ہی کسی پارٹی کے ساتھ تھا جو میری طرح تھوڑی سی بے ایمان ہو لیکن اتنی ایماندار ہو کہ عوام کے جان و مال کے ساتھ انہیں بخیریت ساحل پر پہنچا دیا کرے۔

اگر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والوں سے یہ بات کہتا تو وہ میری پشت میں چھرا گھونپ

شخص ان کی پارٹی کا ساتھ دیتے۔ وہ صرف یہ سننا چاہتے تھے ان کے سامنے آنے والا ہر شخص ان کی پارٹی کا ساتھ دینے والا ہے اپنی ٹیکسی کو سلامت رکھنے کے لئے اور اپنے جسم کو توڑ پھوڑ سے بچانے کے لئے جو پارٹی سواری بن کر میرے سامنے آتی تھی میں اسی کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا تھا موقع محل کی مناسبت سے کامیاب لیڈروں کے وعدوں کی طرح میرے وعدے بھی بدلتے جاتے تھے اتنی سیاست کے باوجود مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دن میری ٹیکسی ان ہنگاموں کی نذر ہوگئی دو سیاسی پارٹیوں کے ٹکراؤ کے درمیان میری ٹیکسی آگئی تھی۔ میں نے وہاں سے ٹیکسی نکال لیجانے کی بہت کوشش کی مگر میں خود پتھراؤ کی زد میں آگیا۔ مجھے مجبوراً ٹیکسی سے نکل کر بھاگنا پڑا۔ اتنے میں پولیس کی طرف سے لاٹھی چارج شروع ہوگیا۔ لوگوں کو دھمکانے کے لئے ہوائی فائر بھی کئے گئے فائرنگ کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی تھوڑی دیر بعد جب میدان صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جلتی ہوئی دکان کے سامنے میری ٹیکسی بھی جل رہی تھی۔

ہم ان ہنگاموں میں کس طرح لٹ جاتے ہیں یہ میرے لٹنے کا منظر دیکھ کر سمجھ میں آسکتا ہے کہ میں نے دس برس پہلے وہ ٹیکسی قسطوں پر لی تھی پورے آٹھ برس تک میں اس کی قسطیں بھرتا رہا تھا قسطیں ادا کرتے کرتے وہ نئی ٹیکسی کھٹارہ بن گئی تھی وہ بیمار پڑتی تھی میں اس کا علاج کرتا تھا۔ وہ میلی ہو جاتی تھی میں اسے نہلاتا تھا وہ روٹھ جاتی تھی، میں کارخانے میں لے جاکر اسے مناتا تھا جو کماتا تھا اس پر خرچ کرتا تھا۔ ایک نخریلی بیوی کی طرح وہ روٹھنے کی ادائیں دکھا دکھا کر میری جیب سے پیسے نکال لیا کرتی تھی وہ جیسی بھی تھی، میری تھی مگر اب میری نہیں رہی تھی میرے سامنے اس کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔

میں نے اس کے قریب جاکر دیکھا وہ باہر سے اور اندر سے اس قدر جل گئی تھی کہ اب وہ مرمت کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے مرمت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے نئے سرے سے ایک نئی ٹیکسی بنانی پڑتی۔ یعنی اسے دوبارہ سڑک پر لانے کے لئے کم از کم دس پندرہ ہزار روپے کی ضرورت تھی میں وہاں سے سر جھکا کر ایک کباڑیئے کے پاس پہنچا۔ کباڑیئے سے اس کا

سودا کرتے وقت میرا دل رو رہا تھا۔

کباڑیئے نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس آہنی ڈھانچے کی قیمت اتنی گرا دی کہ میں نے اسے بیچنا مناسب نہیں سمجھا دو گھنٹے کے بعد جب میں اس ٹیکسی کی طرف واپس آیا تو اتنی دیر میں وہ آدھی رہ گئی تھی جو کل پرزے کام کے رہ گئے تھے لوگ انھیں کھول کر لے گئے تھے اب وہ ایک بوڑھی طوائف کی طرح اتنی کھوکھلی ہوگئی تھی کہ کوئی اس پر نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فروخت کرنا تو دور کی بات تھی میں نے جھنجلا کر اسے ایک لات ماری اور اسے سڑک پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میں بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میں شر پسندوں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ میری ٹیکسی کو جلا کر اور میرے منہ سے دو روٹیاں چھین کر کونسا انقلاب لانا چاہتے ہیں یہ وقت اور یہ ہنگامے گذر جائیں گے کوئی نہ کوئی پارٹی اقتدار سنبھال لے گی مگر امن و امان کے بعد کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ غریب اور غریب ہوگئے ہیں اور بدکاری بے حیائی اور کرپشن اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

میں بھٹکتا ہوا بیلا رانی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ان دنوں ہر گھر کے دروازے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس دروازے پر بھی موت کی سی خاموشی تھی۔ اب سے پہلے میری گاڑی کی آواز سن کر مونا دوڑتی ہوئی دروازے پر آجاتی تھی کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے جاتی تھی کبھی اسکول کی کتابیں اٹھائے میرے پاس ٹیکسی میں آکر بیٹھ جاتی تھی۔ جب سے وہ بھی میری ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تھی تب سے میں نے فٹ پاتھ کی ٹیکسیوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھانا چھوڑ دیا تھا مسلسل دو برس تک میں نے کسی بدکار عورت کا چہرہ نہیں دیکھا صرف اس معصوم بچی کا چہرہ اگلی سیٹ پر دیکھتا رہا جو میری مصلح الدین اور بیلا رانی کی بیٹی تھی۔ ہم تینوں اس معصوم بچی کی حفاظت کر رہے تھے اور وہ بچی ہم میں ایک صاف ستھری زندگی گذارنے کا جذبہ پیدا کر رہی تھی۔

اس روز مونا دروازے پر نہیں آئی کیونکہ اس نے دروازے پر گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی

وہ ٹیکسی روزی کا ذریعہ نہ سہی ایک معصوم بچی کو اپنی طرف بلانے کا چلتا پھرتا کھلونا تھی مجھ سے
میری ٹیکسی اور مونا سے اس کا کھلونا چھن گیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ شام کا وقت تھا
کمرے میں مدھم مدھم سی تاریکی پھیل رہی تھی ایک چارپائی پر مصلح الدین لیٹا ہوا تھا اسی چارپائی کے
سرے پر مونا سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی
وہ دوڑتی ہوئی اور روتی ہوئی آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر رونے کے درمیان سسکیاں لے کر کہنے لگی

"چاچا جی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ امی صبح سے گئی ہیں ابھی تک نہیں آئیں
ابو چپ چاپ پڑے ہیں کچھ بولتے نہیں ہیں پڑوس کی ماسی کہہ رہی تھی کہ شہر میں بہت سے لوگ مر رہے
ہیں ابھی اس اندھیرے میں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ مجھے بھی مارنے کے لئے آ رہے ہیں۔ چاچا جی
آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں امی بہت خراب ہیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں"

اب وہ اونچائی میں میرے کاندھے تک پہنچ گئی تھی مگر ہمارے لاڈ پیار نے اسے دنیا والوں
سے بہت دور ایک معصوم اور بھولی بھالی گڑیا بنا کر رکھا تھا۔ وہ یا تو گھر کی چار دیواری میں رہتی تھی یا
میری ٹیکسی میں بیٹھ کر اسکول آتی جاتی تھی۔ اس کے آگے جو دنیا ہے اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میں
بڑے پیار سے اس کے سر کو سہلاتا ہوا اور پیٹھ کو تھپکتا ہوا تسلیاں دیتا رہا۔ پھر میں مصلح الدین کے
قریب آیا وہ اپنے بستر پر ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس نے صرف دیدے گھما کر مجھے دیکھا
اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ میں نے خیریت پوچھی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔
مونا نے کہا۔

"ابو بہت بیمار ہیں، باتیں نہیں کر سکتے ہیں"

"کب سے بیمار ہیں؟"

"جب سے ریڑھا لوٹ لیا گیا ہے۔ باہر لوگ لوٹتے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں"

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس گھر کے باہر والی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اسی لئے وہ تفصیل
سے مجھے کچھ بتا نہیں سکی۔ میں نے پوچھا۔

"تم نے کیا کھایا ہے؟"

"چاچا جی کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے ابو تو دو مہینے سے بیمار ہیں کبھی کھانے کو مل جاتا
ہے، کبھی ہم بھوکے رہتے ہیں۔ صبح امی کہہ گئی تھیں کہ وہ آپ کے پاس جا رہی ہیں آپ سے
کچھ پیسے لیکر آئیں گی۔ آپ تو آ گئے مگر وہ ابھی تک نہیں آئیں"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"فکر نہ کرو بیٹے میں ابھی تمہارے لئے کھانا اور ابو کے لئے دودھ لے کر آتا ہوں تم
لالٹین روشن کرو اندھیرا ہو رہا ہے"

یہ کہہ کر میں نے دودھ لانے کے لئے برتن لیا اور گھر سے باہر چلا گیا تھوڑی دیر بعد،
کباب، روٹیاں اور دودھ لے کر واپس آنے لگا تو بیلا رانی نظر آئی۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی
اور میں پیچھے تھا میں اُسے آواز دینا چاہتا تھا۔ اسی وقت وہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو گئی
جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ مونا سے کہہ رہی تھی

"بیٹی تمہارے چاچا جی ملے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈھیر سارے پیسے دیے ہیں۔ دیکھو
میں تمہارے لئے کتنی چیزیں لے کر آئی ہوں"

اس کی باتیں سنتے ہی میں دروازے کے باہر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا وہ جھوٹ کہہ رہی تھی کہ
مجھ سے ملاقات ہو چکی ہے اور جو پیسے اس کے پاس تھے وہ میں نے نہیں دیے تھے پھر وہ کہاں
سے لائی تھی ——؟ مونا کی آواز سنائی دی۔

"امی کتنی ساری چیزیں ہیں۔ چاچا جی بھی میرے لئے کھانا اور ابو کے لیے دودھ
لینے گئے ہیں"

"آں" اس کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی "کیا شید یہاں آیا ہے؟"
میں کمرے کے اندر آ گیا۔ بیلا رانی ایک دم سے گھبرا کر کبھی مجھے اور کبھی مصلح الدین کو دیکھنے لگی
مصلح الدین کی زبان بند تھی مگر کان کھلے تھے وہ سب کچھ سن چکا تھا اور بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس کے ساکت

جسم میں اچانک ہلچل سی مچ گئی تھی وہ چت لیٹے ہی لیٹے تھر تھر کانپ رہا تھا بیماری اور نقاہت کے باوجود اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلتی نظر آ رہی تھیں پھر ایک جھٹکے سے اس نے سر گھما کر خون کی قے کر دی۔ بیلا رانی چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی

"نہیں مصلے! تم مجھے غلط نہ سمجھو، میں حرام کے پیسے نہیں لائی ہوں۔ میں نے یہ پیسے شیدے سے ادھار مانگے ہیں۔ شیدے، تم خاموش کیوں کھڑے ہو؟"

وہ مصلح الدین کے پاس سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھے جھنجھوڑتی ہوئی کہنے لگی۔

"شیدے خاموش نہ رہو۔ اسے بتاؤ کہ یہ پیسے تم نے دیے ہیں۔ تم نہیں بولو گے تو میری دنیا لٹ جائے گی۔ یہ کئی بار خون کی قے کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا مکمل علاج نہیں ہو گا تو یہ — یہ ......"

وہ میرے پاس سے دوڑتی ہوئی پھر مصلح الدین کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔

"نہیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ دیکھو میں تمہارے لئے کتنی دوائیں لے کر آئی ہوں، میں نے مزدوری کی ہے مصلے۔ میری مزدوری کی لاج رکھ لو۔ میری مونا کے لئے اچھے ہو جاؤ"

ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئی تھیں۔ میں مصلح الدین کے قریب جا کر اسے سمجھانے لگا کہ بیلا رانی سچ کہہ رہی ہے اس کی دوائیں میرے پیسوں سے آئی ہیں۔ مونا اپنے باپ کے چہرے گردن اور تکیے پر گرے ہوئے لہو کو پونچھ رہی تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرا جھوٹ اس کے آگے سچ نہ بن سکا۔ اس نے پھر قے کر دی۔ بیلا رانی تڑپ کر اٹھ گئی۔ پھر چیخ کر بولی۔

"شیدے! جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ دیکھو ظالموں نے میرے مصلے کا کیا حال بنا دیا ہے؟"

میں جلدی سے پلٹ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے بیلا رانی بھی آ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم مصلح الدین کو چھوڑ کر نہ آؤ۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لیکر آتا ہوں"

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی بولی

"ابھی میں اس کے سامنے رہوں گی تو مجھے دیکھ کر اسے اور تکلیف پہنچے گی"

"بیلا! میں پچھلے ایک ماہ سے یہاں نہیں آ سکا میں بھی شرپسندوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ پرسوں رہا ہو کر باہر آیا تو سوچا کچھ کمائی کر لوں پھر مونا کے لئے کچھ چیزیں خرید کر لے جاؤں گا۔ مگر آج میری ٹیکسی جلا دی گئی ہے آمدنی کا جو واحد ذریعہ تھا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے"

"شیدے! ان سیاسی ہنگاموں نے ہمیں برباد کر دیا ہے۔ مصلح الدین کا رکشہ لوٹ لیا گیا پھر اسے توڑ کر اس کی لکڑیوں کو لوگوں نے مار پیٹ کے لئے ہتھیار بنا لئے۔ اس نے اپنی آخری پونجی کو بچانے کی انتہائی کوششیں کیں۔ اسی دوران قانون کے محافظ آ گئے۔ کسی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہے کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟ قانون کے محافظ سبھی کو ایک لاٹھی سے ہانکنے لگے۔ انہوں نے رائفل کے کندے سے مصلح الدین کے سینے پر کئی ضربیں لگائیں۔ تب سے وہ خون کی قے کر رہا ہے دواؤں سے افاقہ ہوتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر خون تھوکنے لگتا ہے اس کے دل کے پاس کوئی رگ پھٹ گئی ہے اگر توجہ سے علاج نہ ہو سکا تو وہ خون تھوکتے تھوکتے مر جائے گا"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

"وہ بہت خود دار ہے شیدے۔ کہتا ہے بھوکی مر جاؤ۔ مجھے دواؤں کے بغیر مار ڈالو مگر فٹ پاتھ پر نہ جاؤ۔ حرام کا ایک پیسہ بھی لاؤں گی تو میں مر جاؤں گا۔ میں نے کام کرنے کی بہت کوشش کی مگر کام کہاں ملتا ہے۔ کارخانے بند پڑے ہیں دو چار دن کے لئے کھلتے ہیں تو وہاں نئی کام والیوں کے لئے گنجائش نہیں نکلتی۔ کسی گھر میں ہانڈی برتن دھونے کا کام بھی نہ مل سکا پچھلے دنوں میں نے پانی پی کر اور مونا کو ایک وقت کھلا کر دن کاٹے ہیں۔ میں بھوکی رہ سکتی ہوں اور مصلح الدین کی خودداری کو قائم رکھنے کے لئے مر بھی سکتی ہوں مگر ایک معصوم کلی کو مرجھاتے

کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ اپنے مجازی خدا کو دواؤں کے بغیر کس طرح مرتے دیکھ سکتی ہوں۔ دوائیں بند ہو جاتی ہیں تو خون جاری ہو جاتا ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی شیشے میں بہت مجبور ہو گئی تھی اس لئے پھر فٹ پاتھ پر چلی گئی پچھلے دو دن سے میں نے یہ بات مصلے سے چھپا رکھی ہے میں نے سوچا اگر میں دھوکہ دے کر ایک شریف آدمی کو زندہ رکھ سکتی ہوں تو اس کی شرافت کو زندہ رکھنے کے لئے مجھے ذلالت پر اتر آنا چاہیئے۔ ہاں میں ذلیل ہوں جب وہ اچھا ہو جائے گا تو میں اپنے آپ پر تھوکوں گی مگر ابھی اُسے خون تھوکتے نہیں دیکھ سکتی۔

وہ کہتے کہتے اس طرح ہانپنے لگی جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو پھر وہ ذرا دم لے کر بولی۔

”میں مصلے کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لئے رات کو گھر سے نہیں نکل سکتی تھی اس لئے دن کو فٹ پاتھ پر آ گئی۔ میں نے سوچا ہنگاموں میں لوٹ مار کے دوران کوئی مجھے بھی لوٹ کر لیجائے گا تو کم از کم بیس پچیس روپے میری ہتھیلی پر رکھ دے گا مگر لوٹ مار کے وقت جہاں نئے کپڑوں کے تھان، ریڈیو اور ٹی وی سیٹ ہاتھ آتے ہیں وہاں پرانی مشین کو اٹھا کر کون لے جاتا ہے؟“

اس کی باتیں سن کر میں نے اس پر نظر ڈالی تو وہ واقعی کھنڈر نظر آئی۔ وہ بالکل میری ایمبیسی کی طرح تھی جس کے اندر سے لوگ اپنے کام کے کل پرزے نکال کر لے جا چکے تھے اور پچکے ہوئے ڈھانچے کو چھوڑ دیا تھا۔

جس ڈاکٹر سے وہ مصلح الدین کا علاج کرا رہی تھی وہ نہیں ملا۔ ہم دوسرے ڈاکٹر کو لے کر آ گئے۔ اس نے مصلح الدین کو دیکھتے ہی کہا۔

”اس کی حالت بہت نازک ہے اسے دونوں وقت انجکشن لگانے ہوں گے میں جو دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں انھیں فوراً لیکر آؤ۔“

بیلا نے اپنی لائی ہوئی دوائیں اسے دکھائیں ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کے علاج اور اس کی تجویز کردہ دواؤں سے متفق نہیں ہوتا۔ اس نے ڈھیر ساری دواؤں میں سے

صرف ایک دوا کو کارآمد بتایا۔ باقی دواؤں کا نسخہ خود لکھ کر دیا۔ اپنی فیس اور انجکشن کے پندرہ روپے لئے اور تسلیاں دے کر چلا گیا۔

مصلح الدین آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ بیلا رانی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

”میں جو پیسے لائی تھی، وہ دواؤں میں ختم ہو گئے۔ اگر وہ دکاندار یہ دوائیں واپس لے کر نئی دوائیں دے دے گا تو میرا خیال ہے پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

میں نے اپنی جیبیں ٹٹول کر پیسے نکالے۔ میرے پاس اٹھائیس روپے تھے میں نے وہ روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔

”مونا یہاں اکیلی گھبرائے گی، میں یہاں رہتا ہوں تم یہ روپے لے کر جاؤ۔ اگر دوائیں واپس نہ ہو سکیں تو نئی دوائیں خرید کر لے آنا۔“

وہ روپے لیکر چلی گئی میں نے مونا کے پاس آ کر اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

”چلو بیٹے تم کھانا کھا لو۔ تمہاری امی دوائیں لینے گئی ہیں۔ اب تمہارے ابو اچھے ہو جائیں گے۔“

وہ باپ کے پاس سے اٹھ کر چٹائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے سامنے کھانے کی چیزیں رکھ دیں پھر اس کے پاس بیٹھ کر پہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے کھلایا، اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے لقمے اٹھا کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ میں لالٹین کی روشنی میں اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شادی نہیں کی۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے مگر وہ مجھے اپنے ہی جگر کا ٹکڑا نظر آ رہی تھی۔ بچے کھاتے وقت بھی کتنے معصوم اور بے فکر سے کتنے آزاد نظر آتے ہیں اس کی بے فکری نے مجھے دنیا جہاں کی فکروں میں مبتلا کر دیا۔ ٹیکسی نہیں تھی۔ رشتہ نہیں تھا مصلح الدین بیمار تھا اور میں بیکار تھا مگر زندگی کی ضرورتیں چیخ رہی تھیں ابھی مزید دواؤں اور انجکشنوں کے لئے روٹی اور کپڑے کے لئے، مونا کی تعلیم کے لئے اور اس کی معصوم ہنسی کو دائم اور قائم رکھنے کے لئے

صبح و شام پیسوں کی ضرورت تھی پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اس گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے فروخت کر کے کچھ دنوں کے لئے زندگی کو بہلایا جا سکتا تھا۔ میں ٹیکسی سے چھوٹ کر پیدل ہو گیا تھا اور ہم سب پیدل کتنی دور تک چل سکتے تھے؟

مصلح الدین اچانک کھانسنے لگا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے سینے کو سہلانے لگا۔ کھانسی کے دوران پھر اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے اُبل رہی تھیں وہ دہشت زدہ نظروں سے اس اندھیری دنیا کو دیکھ رہا تھا شاید اس اندھیرے میں وہ بیلارانی کو تلاش کر رہا تھا اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے رات کی رانی کو اندھیرے میں بھٹکنے سے روک رہا تھا اس کے سر جھٹکنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خوددار ہے۔ بے حیائی کا ایک پیسہ قبول نہیں کرے گا۔

وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے کھانستے کھانستے پھر خون کی قے کی اور ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کی نبض دیکھی۔ کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکنوں کو سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ بیلارانی کے لیے دھڑکنے والا دل ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا

پتہ نہیں مونا نے میرے چہرے کو کیسے پڑھ لیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آئی۔

"چاچا جی! کیا ہو گیا ابو کو؟ ابو پھر خاموش ہو گئے؟"

وہ باپ کے بہتے ہوئے لہو کو پونچھنے لگی اور اسے آوازیں دینے لگی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ اس کی آوازوں سے بہت دور چلا گیا ہے تو وہ باپ کے چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسی وقت بیلارانی کمرے میں داخل ہوئی میری آنکھیں خشک تھیں کیونکہ یہ پتھریلی آنکھیں رونا نہیں جانتیں مگر بیٹی کو ماتم کرتے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے دوائیں چھوٹ گئیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سر کو جھکا لیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آ کر مصلح الدین کی لاش پر گر پڑی۔

کمرے کی محدود فضا ماں اور بیٹی کی آہ و بکا سے گونج رہی تھی۔ محلے کے پڑوس والے تھوڑی دیر میں آنے لگے۔ عورتوں نے آ کر افسوس کا اظہار کیا، صبر کی تلقین کی، پھر واپس

چلی گئیں کیونکہ بارہ بجے سے کرفیو لگنے والا تھا۔ سبھی کو کل شام تک کے لئے روٹی کی فکر کرنی تھی۔ کچھ لوگ محلے کے دو آدمیوں کی لاشیں لے کر آئے تھے، جو ہنگامے میں مارے گئے تھے ان کے کفن دفن کے لئے چندہ لیا جا رہا تھا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ پاس میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور مصلح الدین کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ درپیش ہے میں نے بیلارانی کو دیکھا اسے روتے اور بین کرتے وقت کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ہوش و حواس میں رہتی، تب بھی اس کے پلے سے کچھ نہ نکلتا کیونکہ اس کے پاس کچھ ہوتا تو وہ دواؤں کے لئے مجھ سے پیسے لے کر نہ جاتی۔

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ دُور دور تک خیالی دوڑ لگائی کہ کسی جان پہچان والے سے کچھ رقم اُدھار مل سکتی ہے یا نہیں؟ مگر ایسے وقت کوئی مہربان نظر نہ آیا۔ میں گھبرا کر مکان سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی یاد آیا کہ ابھی میری ٹیکسی کا ڈھانچہ راستے میں پڑا ہو گا۔ میں اسے اونے پونے فروخت کر کے مصلح الدین کے لئے کفن خرید سکتا تھا۔

اب میری جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں رکشے میں بیٹھ کر وہاں تک جا سکتا۔ مجبوراً بس میں بیٹھ کر جانا پڑا لیکن وہاں پہنچا تو ٹیکسی کا ڈھانچہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کیونکہ اس علاقے میں آٹھ بجے کرفیو لگنے والا تھا اور اب آٹھ بجنے ہی والے تھے۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اکا دکا لوگ جو بھاگے جا رہے تھے وہ نہیں بتا سکتے تھے کہ میری مردہ ٹیکسی کہاں لے جا کر دفن کر دی گئی ہے۔

میں ہار پچھتا کر واپس آ گیا۔ اس وقت تک بیلارانی کو ہوش آ گیا تھا کہ مصلح الدین کو مرنے کے بعد بھی پیسوں کی ضرورت ہے جب تک پیسے نہیں ہوں گے، تجہیز و تکفین کی رسمیں ادا نہیں ہو سکیں گی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی بساط بھر کوشش کر چکا ہوں، کہیں سے پھوٹی کوڑی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اگر تین گھنٹے کے اندر ہم کفن وغیرہ خرید کر نہ لا سکے تو اس کے بعد کرفیو لگ جائے گا۔ کرفیو کے اوقات میں بھی مردے کو دفن کرنے کے لئے خصوصی اجازت مل جاتی ہے لیکن پہلے سے کفن وغیرہ خرید لینا ضروری ہے۔

"اب کیا ہوگا؟" بیلارانی پریشان ہو کر مصلح الدین کی طرف دیکھنے لگی وہ زندگی کے تمام مسائل سے نجات حاصل کر چکا تھا مگر بیلارانی کے لیے مسئلہ بن گیا تھا وہ محلے پڑوس والوں سے مدد مانگنے چلی گئی۔ میں بھی باہر نکل کر کچھ کوشش کرنا چاہتا تھا مگر مونا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چاچا! مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے چھوڑ کر مت جائیے۔"

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک لاش کے ساتھ تنہا کمرے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی اپنے سگوں کی لاش کے قریب تنہا بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہیں اور مونا کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ وہ تو بچی تھی، زندگی کا تجربہ بس اتنا ہی تھا کہ اس نے پہلی بار اپنے گھر میں ایک انسان کو خون تھوک کر مرتے دیکھا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر نہ جا سکا۔ ایک گھنٹے کے بعد بیلارانی خالی ہاتھ واپس آ گئی اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگی۔

"سب اپنی اپنی پریشانیوں کا رونا روتے ہیں سب یہ کہتے ہیں کہ یہ ہنگامے ختم نہیں ہوں گے اسی لیے ہر ایک کو کل کی فکر ہے۔ ایسے میں کون دو چار روپے کی مدد کرتا ہے؟ اور کیا دو چار روپے میں کہیں کفن آتا ہے؟ ہم کتنے دروازوں پر جا کر کفن کے لیے چندہ مانگ سکتے ہیں۔ یہاں پہلے ہی دو لاشوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس شخص نے میرے اور میری بیٹی کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا، اپنے خون کے رشتے توڑ دیے، میری زندگی کا راستہ موڑ دیا۔ ہمارے لیے فٹ پاتھ پر ریڑھا لگاتا رہا اور پولیس والوں سے کبھی مار کھاتا رہا اور کبھی انہیں رشوت دے کر ہمارے لیے آوازیں لگا کر پھل بیچتا رہا۔ اب وہاں سے خون تھوکتا ہوا آ کر صرف ایک کفن کا مطالبہ کر رہا ہے۔ زندگی میں کچھ نہیں مانگا۔ مرنے کے بعد مانگ رہا ہے تو کیا میں اسے چندے یا خیرات کا کفن پہناؤں؟"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔

"یہ آنسو زندگی میں کچھ نہیں دیتے، کسی کے مرنے کے بعد کیا دیں گے؟ صرف پیسہ ہی سب کچھ دیتا ہے اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ ہم مصلح الدین کے والدین تک یہ خبر پہنچا دیں۔"

بیلارانی نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بڑے کرب سے بولی۔

"ہائے! میں اپنے مصلے کے آخری وقت بھی کام نہ آ سکی تم ٹھیک کہتے ہو اس کے والدین کو معلوم ہوگا تو اسے عزت سے کفن نصیب ہوگا اس کے ماں باپ رنچھوڑ لائن میں رہتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو، ہم ایک گھنٹے میں انہیں لے کر یہاں آ جائیں گے۔"

"میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں؟ یہاں مونا اکیلی نہیں رہے گی۔"

وہ پریشانی سے مونا کو دیکھ کر بولی "میں بھی تنہا نہیں جا سکتی۔ جگہ جگہ فوج کے سپاہی راستہ روک کر پوچھیں گے کہ میں کس نیت سے اتنی رات کو تنہا گھوم رہی ہوں؟"

وہ تنہا نہیں جا سکتی تھی۔ مونا کو بھی تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا وہ پہلے ہی لاش کے پاس سے ہٹ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"ہم تینوں ساتھ چلیں گے۔ لاش تنہا رہ سکتی ہے ہم دروازے کو باہر سے بند کر دیں گے صرف گھنٹے آدھ گھنٹے کی بات ہے اگر ہم رکشے میں جائیں گے تو جلدی واپس آ جائیں گے کیا تمہارے پاس دواؤں میں سے کچھ پیسے بچے ہیں؟"

"تمہارے اٹھائیس روپے میں سے صرف آٹھ روپے رہ گئے ہیں۔ کیا آنے جانے کا کرایہ ہو جائے گا؟"

"چلو جانے کا کرایہ تو ہو جائے گا، واپسی میں ہم مصلح الدین کے والدین کے ساتھ آئیں گے۔"

میں مونا کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا۔ بیلارانی نے دروازے پر آ کر مصلح الدین کی لاش پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر مجبوری تھی۔ اس نے دروازے کو بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔ پھر ہم رکشے کی تلاش میں چل پڑے۔ ابھی سڑکوں پر لوگوں کی

آمدورفت تھی۔ دوسرے دن شام تک گھروں میں بند رہنے کے لیے ضروری سامان کی خرید وفروخت ہو رہی تھی ہمیں جلد ہی رکشہ مل گیا ہم تینوں افراد کو رکشے میں بٹھانے کے لئے اس نے میٹر سے ایک روپیہ زیادہ لیا۔ اور ہمیں رنچھوڑ لائن تک پہنچا دیا۔

سیاسی ہنگاموں کے دوران رنچھوڑ لائن ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہنگامے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کرفیو کی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ وہاں راتوں کو بھی اچھی خاصی رونق رہتی تھی وہاں قانون سے کھیلنے والوں نے شراب، جوئے اور وی سی آر پر بھارتی فلمیں دکھانے کے اڈے قائم کر رکھے تھے اور عیاش طبع لوگ عورتوں کی تلاش میں سڑکوں پر بھٹکتے رہتے تھے۔ ہم مصلح الدین کے گھر پہنچے تو کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ صاحب لوگ لاہور چلے گئے ہیں ہنگامے ختم ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔

میں اور بیلارانی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ہم پورے یقین کے ساتھ وہاں گئے تھے کہ والدین اپنی نافرمان اولاد سے کتنی ہی نفرت کریں مگر آخری بار اس کا دیدار ضرور کرتے ہیں اور تجہیز و تکفین کی آخری رسوم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ہم مصلح الدین کے والدین تک اس کے مرنے کی خبر بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ہم مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ گئے۔ واپسی کے لیے پورا کرایہ نہیں تھا مونا میرے بازو سے لگی چل رہی تھی اس نئی نسل کے ساتھ چلتے وقت احساس ہوا کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور ہر طرف سے اتنا ٹوٹ چکا ہوں کہ ایک جوان ہونے والی بیٹی کا بھی سہارا نہیں بن سکتا۔ بیلارانی یوں بڑبڑاتی جا رہی تھی جیسے ہوش و حواس کھو چکی ہو۔

”میرا مصلح کیوں مر گیا؟“ وہ سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی۔

”اس لیے مر گیا کہ وہ خوددار تھا۔ اپنی زندگی میں وہ حرام کا ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

ہم ایک گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور ایک کھمبے کے پاس نیم تاریکی میں کھڑے ہو گئے ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں جائیں اور کیا کریں؟ وہ بدستور بڑبڑا رہی تھی۔

اس کے بڑبڑانے کے دوران دو شرابی لڑکھڑاتے ہوئے گزرتے ہوئے ہمیں دیکھ کر رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں نیم تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگے اچانک ہی بیلارانی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہمارے درمیان سے نکلی اور ان کے سامنے پہنچ گئی وہ دونوں نشے میں تھے انہیں نئے اور پرانے مال، تازہ اور باسی کھانے کی پہچان نہیں تھی نشے کی حالت میں وہ بیلارانی کی عمر کا حساب نہیں کر سکتے تھے اس لیے خوش ہو کر سودا طے کرنے لگے۔

اسی وقت ایک اسکوٹر موٹر کار آتا ہوا وہاں سے گزرا۔ اس کی ہیڈلائٹ کی روشنی مجھ پر سے ہوتی ہوئی مونا پر سے پھسلتی ہوئی اور نیم تاریکی میں ایک کلی کے حسن کو اجاگر کرتی ہوئی گزر گئی۔ اچانک ہی سودا کرنے والوں کو نئے اور پرانے کی پہچان ہو گئی۔

وہ پچکے ہوئے ڈھانچے کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے نئی کلی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ چشم زدن میں ایک کلی اپنی شاخ سے ٹوٹ کر طوفانی ہواؤں کی زد میں ادھر سے ادھر ہوتی نظر آئی تو پہلی بار۔ زندگی میں پہلی بار میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اب کس کے لیے بے حیائی کا کفن خریدنا تھا۔ ایک خوددار انسان کے لیے ایک مرجھائے ہوئے پھول کے لیے، یا ایک معصوم نوخیز کلی کے لیے.....؟

www.FreePdfBooks.org